

شاعرِ مشرق اور شاعرِ نیل

(ایک تقابلی مطالعہ)

تحقیقی مقالہ برائے ایم فل

مقالہ نگار
صاعقه امین

معاون نگران
ڈاکٹر شاد حسین اندرابی

نگران
پروفیسر بشیر احمد نجوى

اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی
کشمیر یونیورسٹی، سرینگر

فہرست

صفحہ نمبر

نمبر شمار

1

ا:- پہلا باب

دُورِ اقبال و حافظ ابراہیم میں بر صغیر اور مصر کے سیاسی،
سماجی، ثقافتی، اقتصادی اور ادبی حالات

29

ب:- دوسرا باب

دُورِ اقبال اور حافظ ابراہیم میں اردو و عربی شاعری

57

ج:- تیسرا باب

موضوعاتِ شعری حافظ ابراہیم اور علامہ اقبال

133

د:- چوتھا باب

اقبال اور حافظ ابراہیم: تقابلی مطالعہ اور قدر مشترک

159

پا:- پانچواں باب

شاعر مشرق و شاعر نیل: حاصل تحقیق

پیش لفظ

بِرْ صَغِيرٍ أَوْ مَصْرُّهُ مَالِيَهُ كَبِرْ فَبُوشْ چوٹیاں اور مصر کے صحراء شاعرِ مشرق اور شاعرِ نیل، علامہ اقبال اور حافظ ابراہیم دونوں کو شاعری کے حوالے سے ایک ساتھ تقابل اور ممائت میں پیش کرنے کا ارادہ کئی برسوں سے تھا لیکن اس کی تکمیل کے لئے جو موقع نصیب ہوا اُس کے لئے میں کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اقبالیات کی مرہون منت ہوں۔

کشمیر یونیورسٹی میں شعبۂ اقبالیات اب محض ایک شعبۂ علم ہی نہیں بلکہ علمی و ادبی میدان میں اپنی تنوع اور وسعت کے لحاظ سے اس میں چار چاند لگ گئے ہیں۔ اس شعبے نے اس عظیم شاعر، فلسفی و مفکر کے شعر و فکر و فلسفے سے متعلق کتابیں، تحقیقی مقالات و مضمایں، رسائل و جرائد، ریڈیو ای اے و ٹیلی پروگرام، علمی مجالس، اقبالی موضوعات پر تحریری و تقریری مقابلوں اور اسی طرز کی کئی کاؤشوں سے اس شعبے کو ایک ہمہ جہت تحریک بنادیا ہے۔ اس کا سہرا دراصل شعبے کے ڈائریکٹر جناب بشیر احمد نجومی کے سر بندھتا ہے، جن کی لگن، محنت اور جانفشنائی اس صورت میں رنگ لائی کہ چمن، گلستان بن گیا۔

علامہ اقبال اور حافظ ابراہیم اپنے دور کے عظیم شعراء تھے۔ انہوں نے اپنی شاعری سے نہ صرف اپنے دور بلکہ آنے والے دور کو بھی متاثر کیا۔ آج بھی شاعری کی رہگز رپریہ دونوں شعراء مشعل راہ بنے ہوئے ہیں۔

درactual ہر شاعر اپنے ارد گرد کے ماحول میں اس طرح رچا بسا ہوتا ہے کہ وہ اپنے آس پاس ہو رہے تغیرات کو ایک زبان بخشتا ہے۔ اُس کی زبان سے ادا ہونے والا ہر لفظ ہر اُس تبدیلی کا ترجمان ہوتا ہے جس کے پس پر دعوام کی اُمنیگیں، آرزوئیں اور کاشیں ہوتی ہیں۔ وہ لوگوں کے دروغم کی زبان ہوتے ہیں۔ اُن کی مسکراہٹوں اور خوشیوں کو الفاظ کا حسین جامہ پہناتے ہیں۔ اُن کے کہے ہوئے اشعار درactual لوگوں کے دلوں میں محلنے والے وہ جذبات ہوتے ہیں جنہیں ادا کرنے کے لئے وہ الفاظ اور ترمذ ڈھونڈتے رہتے ہیں۔

وہ اپنے وطن کے ہر ذریعے، اہلہاٹے کھیتوں، پہاڑوں، دریاؤں اور وادیوں کی تعریف و توصیف کر کے لوگوں کے دلوں میں اپنے وطن عزیز کے تیئیں محبت بھر دیتے ہیں۔ اُنہیں تواریخ کے اوراق سے بہادری اور سرفروشی کی داستانیں سننا کر اُن کے اندر جوش اور جذبہ بھر دیتے ہیں۔ وہ قوموں کو باطل اور استعمار کے خلاف نبرد آزمائہونے کے لئے تیار کرتے ہیں۔ افراد کے بازوؤں میں بلا کی طاقت بھر دیتے ہیں، جس سے وہ انقلاب کا باعث بن جاتے ہیں۔

اقبال اور حافظ ابراہیم جیسے عظیم شعراء کے درمیان تقابلی مطالعہ اور قدرِ مشترک کا جائزہ پیش کرنے والا یہ مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔

پہلے باب میں دورِ اقبال و حافظ ابراہیم یعنی اُنیسویں صدی کے نصفِ آخر سے بیسویں صدی کے وسط تک برصغیر اور مصر میں رونما ہونے والے سیاسی، سماجی، ثقافتی، اقتصادی اور ادبی

حالات کا طائرانہ جائزہ لیا گیا ہے۔

دوسرے باب میں مصر کی جدید عربی شاعری یعنی عصر الاصلاح اور برصغیر میں وہی سے لیکر اقبال تک کی اردو شاعری کے اسلوب، روایات، رجحانات اور اضناف پر سیر بحث حاصل کی گئی ہے۔

تیسرا باب میں دونوں شعراء کی شاعری کے مختلف ادوار اور ان کی مختلف شعری اضناف میں طبع آزمائی، شاعری کے موضوعات، اسالیب، فنی وادبی خوبیوں، عناصروں رجحانات اور اندازی بیان پر مدلل بحث کی گئی ہے۔

چوتھے باب میں دونوں شعراء کی شخصیت، موضوعات، اسلوب، فکر و فن اور اندازی بیان کا تقابی جائزہ لیا گیا ہے۔ علاوہ ازین دونوں کے درمیان مطابقوں اور مماثتوں کا بھی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

پانچویں اور آخری باب میں حاصل تحقیق کے حوالے سے موضوعات بحث کے مرکزی خیال کو منطقی انعام تک پہنچایا گیا ہے۔

میرا یہ مقالہ شاعر مشرق یعنی علامہ اقبال اور شاعر نیل یعنی حافظ ابراہیم کے درمیان صرف تقابی جائزہ اور قدِ مشترک ہی نہیں بلکہ اس زمانے کی برصغیر اور مصر کی سیاسی، سماجی، ثقافتی اور ادبی تاریخ کا ایک مختصر احوال بھی ہے۔ اس کے علاوہ اس مقالے میں اس دور کی برصغیر اور مصر کی اردو عربی شاعری کے موضوعات، مضامین اور اسلوب کا بھی مختصر ا جائزہ لیا گیا ہے۔

امید کرتی ہوں کہ یہ تحقیقی مقالہ دونوں شعراء کے علاوہ اردو و عربی شاعری کے حوالے سے تحقیق کرنے والے طلباء کے لئے معیاری مواد کی فراہمی کے لئے ایک کار آمد نسخہ (Source) ثابت ہو گا۔

مقالے کی تکمیل پر اللہ رب العزت کا حمد و ثناء بجالاتی ہوں کہ مجھنا چیز کو یہ اعزاز بخشش کہ اس بحرِ بیکراں میں غوطہ زن ہونے کا موقعہ نصیب ہوا۔ اس کے بعد اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی کے ڈائریکٹر اور میرے استاد و نگرانِ محترم پروفیسر بشیر احمد نجومی صاحب کی بے حد ممنون ہوں ہوں کہ جن کی باریک بین مگر مہربان نگرانی میں اس مقالے کی تکمیل ہوئی۔ انہوں نے قدم قدم پر نہ صرف میری رہنمائی و حوصلہ افزائی کی بلکہ اپنی پدرانہ شفقتوں سے بھی سرفراز کیا۔ میں شعبۂ عربی کے پروفیسر ڈاکٹر شاد حسین اندرابی صاحب کی بھی بے حد مشکور ہوں جو کہ مقالے کے معاون نگران رہے اور اپنی رہنمائی سے مجھے ہمیشہ نوازتے رہے۔

اس کے علاوہ میں اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی کی پروفیسر محترمہ تسلیمیہ فاضل صاحب، جناب فرید پرتقی پروفیسر اقبال انسٹی ٹیوٹ اور ڈاکٹر احمد مشتاق صاحب کاشنکر یہ ادا کرتی ہوں جنہوں نے وقاً فوًقاً مجھے اپنے زریں مشوروں سے نوازا۔

میں شعبۂ اقبالیات کے غیر تدریسی عملے اور اقبال لائبریری سے منسلک عملے کی بھی بے حد مشکور ہوں جنہوں نے مواد کی فراہمی کے سلسلے میں مجھے ہر مرحلے پر اپنے تعاون اور شفقت سے نوازا۔

آخر پر میں اپنے شرکیں حیات شوکت سرور اور اپنی بیٹی صبیحہ سرور کا خصوصی طور پر شکر یہ ادا کرتی ہوں جو کہ اس تحقیق کے دوران ہر دم ہر طرح سے میرے معاون بنے رہے۔ اُن کے بغیر اس مقالے کی تکمیل کا تصور بھی ناممکن تھا۔

صاعقه امین



☆.....پہلا باب

دورِ اقبال و حافظہ ابراہیم میں بر صغیر اور مصر

ہ.....سیاسی حالات

ہ.....سماجی، ثقافتی و اقتصادی حالات

ہ.....ادبی حالات

دورِ حافظ ابراہیم میں مصر کے سیاسی حالات:-

حافظ ابراہیم نے جس وقت آنکھیں کھولیں اُس وقت مصر پر خدیو حکمرانوں کی عملداری تھی۔

جس کا بانی محمد علی پاشا تھا۔ حافظ ابراہیم دراصل خدیو اسماعیل پاشا کے دورِ حکومت کے وسط میں پیدا ہوئے۔ اُس زمانے میں مصریوں کا رجحان تُرکوں کی بجائے یورپ کی طرف تھا۔ یورپ کی تقلید مصریوں کی مجبوری تھی کیونکہ اسماعیل پاشا یورپ سے اس قدر مانوس تھا کہ اُس نے اعلان کیا تھا کہ مصر مشرق کا نہیں بلکہ یورپ کا حصہ ہے۔ اس کے دورِ حکومت میں مغربی تہذیب و تمدن کی انداھا دُھنڈ تقلید کی گئی اور اس کے لئے خزانہ عامرہ کامنہہ کھول دیا گیا۔ جس سے مصری معیشت کا دیوالیہ نکل گیا اور یوں فرانس اور برطانیہ کو مصر کے اندر ورنی معالات میں مداخلت کرنے کا موقع مل گیا۔

اُنہوں نے سخت شرائط پر مصری حکمرانوں کو فرضے جات و اگزار کئے تاکہ ان کا تسلط بنار ہے۔ فرضہ جات کی ادائیگی کی سخت شرائط سے تنگ آ کر اسماعیل پاشا نے ۱۸۷۹ء میں زمامِ اقتدار اپنے بیٹے توفیق کے حوالے کر دیا۔ جس کے زمانہ حکومت میں نہ صرف مصری مالیات کا سارا نظام برطانیہ اور فرانس کے ہاتھوں میں چلا گیا بلکہ اُنہوں نے مصر کے سیاسی اور فوجی معاملات میں دخل اندازی شروع کر دی۔ اس بیرونی عملِ دخل سے تنگ آ کر مصری فوج کے کمانڈر عربی پاشا نے ۱۸۸۱ء میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کر دیا جسے بڑی سختی کے ساتھ چل دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی مصر کا مکمل طور پر برطانیہ کے فوجی شکنے میں آگیا اور سیاسی، معاشی اور اقتصادی معاملات میں مکمل طور پر انگریزوں کا دست نگر بن گیا۔ عربی پاشا کی بغاوت دراصل جمال الدین افغانی کی کوششوں کا نتیجہ تھی جو کہ بین الاسلامی اخوت کے علمبردار تھے اور جنہیں بعد میں ۱۸۷۹ء میں مصر چھوڑ کر جانا پڑا۔

ایک سال قبل اُنہوں نے محمد عبدہ کے ساتھ میں ایک آزاد اطمینی و قومی جماعت

”الحزب الوطني الحر“ کی بنیاد ڈالی تھی جو کہ بعد میں عربی کے ناکام انقلاب کا محرك بی۔

۱۸۸۲ء میں لارڈ کر و مر مصر کے ایڈمنیسٹر پیر مقرر ہوئے۔ انہوں نے مصر کے معاشری بحران پر قابو پانے کے لئے زراعت کی ترقی پر توجہ دی۔ لیکن ساتھ ہی مصر پر برطانوی قبضے کو مزید مستحکم کرنے کے لئے مصری عوام پر بے حد ظلم و ستم ڈھایا۔ ۱۸۹۲ء میں عباس حلمی کے دورِ حکومت میں مصری قومی تحریک پھر سے زور پکڑنے لگی۔ ایک عام خیال کے مطابق وہ ذاتی طور پر انگریزوں سے نفرت کرتا تھا۔ اس لئے اُس نے خود مصریوں کے اندر وطنیت کے جذبات بیدار کر کے انہیں انگریزوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا۔ تقریباً اسی زمانے میں مصطفیٰ کامل پاشا مصری سیاست کے اُفق پر نمودار ہوئے۔ انہوں نے ۱۸۹۹ء میں ”اللواء“ نامی اخبار جاری کیا اور اپنی شعلہ بار تقریروں سے مصریوں کو فرنگیوں کے خلاف ابھارا۔ انہوں نے ”الحزب الوطني“ پارٹی کی داغ بیل کی اور مصریوں کو صحیح سیاسی شعور سے آشنا کیا۔ ادھر عوام نے عباس حلمی کی وطنی اور قومی خدمات کے اعتراف میں اُسے ”عزیز مصر“ اور ”امیر جلیل“، جیسے القاب سے نوازا۔ حافظ ابراہیم نے بھی ۱۹۰۲ء میں اُن کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا۔

رَدَدَتْ مَا سَلَبْتُ أَيْدِي الزَّمَانِ لَنَا..... وَمَا تَقْلُصَ مِنْ ظِلٍ وَ سُلْطَانٍ

(ترجمہ: تم نے ہمیں لوٹا دیا جو کچھ زمانے کے ہاتھوں نے ہم سے چھین لیا تھا اور جو کچھ ہمارا اقتدار اور سایہ گھٹ گیا تھا وہ بھی لوٹا دیا۔)

۱۹۰۵ء سے لے کر جنگ عظیم اول تک حزب الوطنی جماعت نے انگریزوں کے خلاف اپنی کارروائیوں کو جاری رکھتے ہوئے مصر کی قومی تحریک کی قیادت کی۔ پھر اسی زمانہ میں شیخ علی یوسف کی قیادت میں ”حزب الاصلاح“ نامی ایک اور سیاسی جماعت وجود میں آئی۔ اسی پیچ انگریزوں نے ”پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو“ کی پالیسی کے تحت ”حزب الامم“ نامی حکومت نواز سیاسی جماعت کو

وجود بخشش اور اس طرح مصری قوم دو بڑے سیاسی گروہوں میں بٹ گئی۔ اُس دور کے سبھی شعراء جن میں حافظ ابراہیم بھی شامل تھے نے اس سیاسی انتشار اور مصریوں کی نااتفاقی کو اپنے اشعار کا موضوع بنایا۔

چونکہ پہلی عالمگیر جنگ میں ترکی جرمنوں کا حليف بن کر شامل ہوا تھا اس لئے انگریزوں نے اس بات کا بُرا امانتے ہوئے ترکی کے اثر و رسوخ کو کم کرنے کے لئے مصر کو براہ راست اپنے کنٹرول میں لینے کا اعلان کر دیا اور یوں مصر اور ترکی کے رشتہ کو ختم کر دیا۔ اس اعلان کے بعد عباس کو معزول کر کے حسین کامل کو تخت نشین کیا گیا اور یوں انگریز مصر کی سر زمین پر سفید و سیاہ کے مالک بن بیٹھے۔ انہوں نے ظلم و ستم اور لوٹ کھسٹ کا بازار گرم کر دیا۔ پہلی عالمگیر جنگ کے خاتمے پر ۱۹۱۸ء میں مصر میں وسیع تر بینادوں پر ایک نئی سیاسی تنظیم ”الوفد المצרי“، کو تشکیل دیا گیا۔ جس کی قیادت سعد زغلول جیسے شعلہ بیان مقرر اور بے مثال مدبر کے ہاتھوں میں تھی۔ انہوں نے مصری قوم کی نئی سرے سے صفائی کی لیکن انہیں ۱۹۱۹ء میں کئی ساتھیوں سمیت مالٹا جلاوطن کر دیا گیا لیکن اس طرح کے حربوں سے مصری مزاحمت کا سیلا ب نہ رُک سکا۔ مصر کے چھے چھے سے بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھے۔ عوام کا ہر طبقہ حتیٰ کہ مصر کی معاشرتی و سیاسی تاریخ میں پہلی بار عورتیں بھی سڑکوں پر مظاہرے کرنے کے لئے گھروں سے باہر نکل آئیں۔

آزادی کی اس عظیم بغاوت کو اگرچہ انگریزوں نے طاقت کا بے تحاشا استعمال کر کے گھل دیا لیکن ساتھ ہی انہیں احساس ہوا کہ اب وہ زیادہ دیری تک مصر پر اپنا تسلط برقرار نہیں رکھ سکتے۔ دوسری جانب بغاوت کی سرکوبی مصری عوام کے حوصلوں کو پست نہ کر سکی اور وہ پوشیدہ طور پر اپنے مقصد میں مشغول رہے۔ اس دوران سید زغلول اور انگریز حاکموں کے درمیان مذاکرات کے کئی دور چلے جو کہ کئی بارنا کام ہوئے اور کبھی ہلکی سی پیش رفت کا باعث بنے۔ بحر حال ۲۸ فروری

۱۹۲۲ءے کو ان طویل مذاکرات کے نتیجے میں ایک اعلان نامے پر دستخط ہوئے۔ جس کی رو سے مصر کو ایک آزاد اور مطلق العنوان ریاست تسلیم کیا گیا۔ ۱۵ ار مارچ ۱۹۲۲ءے کو احمد فواد نے مصر پر اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا اور ۲۳ اپریل ۱۹۲۲ءے کو نئے آئین کا نفاذ عمل میں آیا۔ اس کے بعد ہونے والے انتخابات میں سعد زغلول کی وفاد پارٹی کو زبردست اکثریت ملی۔ ۱۹۲۲ءے سے ۱۹۳۶ءے تک کا عبوری زمانہ مصر میں آئینی لحاظ سے افراتفری کا زمانہ تھا۔ اس دوران کبھی آئین کو معطل کیا جاتا اور کبھی بحال۔ سلطان فواد اور وفاد پارٹی کے درمیان اختلافات شدت اختیار کر گئے۔ آخر کار ۱۹۳۵ءے کے انتخابات میں ایک بار پھر وفاد پارٹی کو حکومت بنانے کا موقع ملا اور یوں حافظ ابراہیم کی وفات کے چار سال بعد یعنی ۱۹۳۶ءے میں ایک معاہدے کے ذریعے مصر پر برطانوی تسلط کے خاتمے کا اعلان کیا گیا اور ۲۶ مئی ۱۹۳۶ءے میں مصر کو انجمن اقوام کا نمبر چھن لیا گیا۔
 دو رِ حافظ ابراہیم میں مصر کی سماجی و ثقافتی حالت:-

حافظ ابراہیم کے دور کا مصری سماج غربت اور نادری میں لپٹا ہوا تھا۔ چاروں طرف خرافات و بدعتات اور جہالت و پسمندگی چھائی ہوئی تھی۔ حالانکہ یہ اپنے طور پر ایک اسلامی طرز کا سماج تھا لیکن اس میں غیر اسلامی طرز کے رسم و رواج کا غلبہ تھا۔ یہاں اس بات کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ مصری سماج پر ترکی لنسل افراد کا کافی اثر تھا جو کہ اپنی رسوم و روایات اور روادار یوں کو نبھانا اپنی شان سمجھتے تھے۔ حتیٰ کہ وہ عربی پر ترکی زبان کو فوقيت دیتے تھے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ مصر پہلی عالمگیر جنگ تک روحانی اور سماجی اعتبار سے خلافت عثمانیہ کے زر نگیں تھا اس لئے اہل ٹرک کو سماجی، معاشرتی، اخلاقی اور سیاسی برتری حاصل تھی اور مصری بھی ان سے متاثر تھے اور ان کے لئے دل میں جذباتی اور نہ ہی لگاؤ رکھتے تھے۔ لہذا مصری بھی ان کی ایتابع فخری یا انداز میں کرتے تھے۔

بیسویں صدی کے دوسرے اور تیسرا عشرے میں مصریوں اور ترکوں کے درمیان غلط فہمیوں کا آغاز ہوا جن کے اصلی محرک انگریز تھے۔ انہوں نے کمال ہوشیاری سے دونوں کے درمیان نفاق کا نتیجہ بودیا جو کہ آپسی رنجشوں اور کردورتوں کا باعث بنا۔

حالانکہ مصریوں نے مغربی تہذیب و تدن کے رنگ ڈھنگ اور اُس کی ظاہری چکا چوند کو نپولین کے حملے کے بعد ہی دیکھنا شروع کیا تھا لیکن انہیں اسماعیل پاشا کے دور میں اس تہذیب کو قریب سے پر کھنے کا موقع ملا کیونکہ اسماعیل پاشا مصریوں کو یورپی رنگ میں ڈھالنا چاہتا تھا۔ اس کے دور حکومت میں از ہری، دینی، شرعی اور اسلامی طرز کے مدارس قائم ہونے کے ساتھ ساتھ یورپی طرز کے اسکول بھی جگہ جگہ کھولے گئے۔

”ترکوں سے اختلاف اور مغربی تہذیب کے اثرات نے مصر میں قدیم و جدید روایات کے عجیب و غریب منظر دکھائے کہ عباس حلمی کے دربار میں ایک طرف درسِ قرآن کا اہتمام ہوتا تھا اور دوسری طرف جدید طرز کے چنگ و رباب کی محفلیں بھی سجائی جاتی تھیں۔“
دورِ حافظ ابراہیم کا مصری سماج، رشوت ستانی، ضمیر فروشی، اپنوں کے خلاف سازشوں اور فسق و فجور میں پیش پیش تھا۔ ارل کروم (Earl Cromer) اس دور کی سماجی، معاشری اور اقتصادی احوال پر رoshni ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

”مصر میں عام کاشتکار مغلسی کی زندگی بس رکر رہا تھا۔ قانون امراء کے لئے خاص تھا اور وہی اس سے فائدہ اٹھاتے، ہر ایک صدر مقام پر کوڑا لٹکا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ ظلم و جبر سے حکومت کی جاتی۔ امراء، دولت کے نشے میں سرشار تھے اور لوگوں کو

مختلف حیلوں اور بہانوں سے لُٹ لیا کرتے تھے۔^۱

حافظ ابراہیم چونکہ اسی سماج میں انہی حالات میں پلا بڑھا تھا اور اُس نے تنگستی اور فقر و فاقہ کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ یہی وجہ ہے اُس نے سماج کی ستم ظریفیوں، کلفتوں اور آلام و مصائب کو پُرسوز انداز میں بیان کیا ہے۔ اُن کی شاعری اپنے وقت کے سماج کا آئینہ ہے۔ اُن کے بیشتر قصائد میں معاشرے کی اصلاح و تبدیلی کا رجحان ملتا ہے۔

اپنے ارد گرد ہو رہے واقعات اور ان کو جھیل رہے جیتے جا گئے انسانوں کی داستانِ الْمَ بیان کرنے میں حافظ ثانی نہیں رکھتا۔ وہ ایک غمزدہ لڑکی کی ابتر حالت کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:

شَبَّ حَارِيْ أَمْ ذَالِكَ طَيْفٌ خِيَالِيٌّ لَا بَلْ فَتَاهَةٌ بِالْعِرَاءِ حِيَالِيٌّ

أَمْسَتْ بِمَدِ رَجَةَ الْخَطُوبِ فِمَالَهَا رَاعِيْ هَنَاكَ وَ مَالَهَا مِنْ وَالِيٌّ^۲

(ترجمہ:- موہوم شکل دیکھ رہا ہوں یا نیند کی کیفیت میں دیکھ رہا ہوں نہیں بلکہ وہ کھلے میدان میں میری طرف بڑھتی ہوئی دو شیرہ ہے
وغم اور پریشانیوں کی دلیل پڑھتی ہوئی تھی جہاں اُس کا نکوئی نگراں تھا اور نہ سر پرست۔)

ایک اور جگہ وہ کسی مسکین اور لاچار لڑکے کی بدحالی کی تصویر کچھ اس طرح سے کھینچتے ہیں:

هَذَا صَبَرِيُّ هَالِمُ تَحْتَ الظَّلَامِ هُيَامٌ حَائِرٌ

أَبْلِي الشَّقَاءُ جَدِيدٌ وَ تَقْلِمَتُ مِنْهُ الْأَطَافِرُ

فَانْظَرْ إِلَى أَسْمَالِهِ لَمْ يِقِ مِنْهَا مَا يُظَاهِرَ^۳

(ترجمہ:- یہ بے کس بچہ اندر ہیروں میں حیران و مرگراں ہے۔ بدختی نے اس کی رعنائیوں کو تاتار کیا ہے۔

میں نے اس کے خن تراشے کے پھٹے پرانے کپڑوں کی طرف دیکھوں میں ذرا بھر بھی آبتاب نہیں۔)

مصر میں قحط اور خشک سالی کے حالات پیدا ہونے پر حافظ ابراہیم نے اُس دور کی معاشی اور اقتصادی بدهی کا ہو بہون نقشہ کھینچا ہے۔

وَغَدِ الْقَوْثُ فِي يَدِ النَّاسِ كَالِيَا
وَيَخَالُ الرَّغِيفُ فِي الْبَعْدِ بَدْرًا
(ترجمہ:- غذائی اجنس لوگوں کے لئے یا قوت کی طرح تیقی ہو گئیں۔ پس غریبوں نے روزہ کا ارادہ کیا، وہ روٹی کو دور سے چاند سمجھنے لگے اور گوشت کو رام شکار۔)

اُس دوران مصري سماج میں عورتیں عموماً پر دہ رہتی تھیں اور انہیں گھر کی حدود پھلانے کا اختیار نہ تھا۔ اُن کے لئے کسی سماجی تہذیبی اور سیاسی سرگرمی میں حصہ لینا معموب تو تھا ہی مگر سخت منع بھی تھا۔ اس ظلم و ستم کے خلاف قاسم امین نامی ایک مصری ادیب اور مصلح نے عورتوں کی آزادی سے متعلق ایک تحریک شروع کرائی۔ اس میں یہ مانگ کی گئی تھی کہ عورت کو اسلام کے عین مطابق زندگی بسر کرنے دی جائے جس میں اُن کا ہاتھ اور چہرہ کھلا رکھنا اور اپنی ضرورتوں کے سلسلے میں باہر جانے پر زور دیا گیا تھا۔ ۱۹۰۸ء میں اُن کے انتقال کے بعد بھی آزادی نسوان کی تحریک زور و شور سے چلتی رہی جس کا ثمریہ نکلا کر ۱۹۱۹ء کی بغاوت میں مردوں کے شانہ بشانہ عورتیں بھی مزاحمت پر اتر آئیں اور انہوں نے مظاہروں میں حصہ لیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ مصری سماج بالغ انظر ہونے لگا اور عورتوں نے مظاہروں کے علاوہ سماجی، ثقافتی اور تہذیبی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیا۔ علاوہ ازیں انہوں نے انجمنوں اور اداروں کا قیام عمل میں لا کر عام عورتوں کی بیداری کے اقدامات بھی شروع کئے۔ حافظ ابراہیم نے آزادی نسوان کی کاوشوں کو اپنی شاعری میں خصوصی جگہ دی ہے۔ انہوں نے اپنے مشہور قصیدے ”جمعیۃ المرأة“ میں اپنے جذبات و احساسات کا اظہار بہت حسین انداز میں کیا ہے۔

إِلَيْكَ يَهْدِي النِّيلُ أَلْفَ تِحِيَّةٍ
 أَقْمَنَ بِلَاءَ مِنَ الْأَسَّ مَبَارِكًا
 مُعْطَرٌ فِي أَسْطُرِ عَطَرَاتٍ

(ترجمہ:- اے خواتین، نیل کی طرف سے تمہارے لئے ہزار سلام، جو مہکتی سطروں سے
 معطر ہیں۔ جنہوں نے امن و سکون کے ساتھ برکت بھری بُنْيادُ الْمُلْك، فتح و کامرانی کی اور تم خوشیوں اور
 مسرتوں کے ساتھ حاضر ہوئیں۔)

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مصری عورتوں نے روایتی پردے کو خیر باد کہہ کر تعلیمی میدان
 میں اپنے آپ کو علم کے زیور سے آراستہ کرنا شروع کر دیا اور یوں مصری سماج کا یہ ساکت و جامد طبقہ
 بھی علم کی روشنی سے منور ہو گیا۔

جس دور میں مصری عورتیں اپنی ایک پہچان قائم کرنے اور اپنے حقوق کی حصولیابی کے لئے
 مصروف پیکار تھیں۔ اسی زمانے میں مصر کے دیہاتوں میں بے جان اور فرسودہ رسوم و عادات کا دور
 دورہ تھا۔ طبقاتی فرق اپنے شباب پر تھا۔ خصوصاً شادی بیاہ کے معاملات میں اونچ تھج اور بھیڑ بھاؤ زیادہ
 شدید تھا۔ مگر جوں جوں تعلیم عام ہوئی تو مصری لوگ جدید تہذیب سے آشنا ہوئے۔ انہوں نے نئی
 تہذیب، نئے تہذن اور نئی ثقافت کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ لوگوں نے زندگی سے وابستہ
 نئے مسائل کے سمجھنے اور انہیں حل کرنے کی طرف لچکسی دکھائی تو اس طرح سے مصری سماج میں ایک
 ہمہ گیر تبدیلی رونما ہوئی۔ طبقاتی نظام سے لوگ نفرت کرنے لگے اور زندگی کے مختلف شعبہ جات میں
 نئی تبدیلیوں کے پیش نظر مصری معاشرہ ایک جدید اور صحت مند سماج کی طرف گامزن ہونے لگا۔

چھاپ خانہ کے استعمال نے علم کے نور کو پھیلانے اور جہالت کے اندر ہیرے کو دور
 کرنے میں اہم روں ادا کیا۔ اہل مصر کو نیا ماحدول راس آیا اور مغربی نظام زندگی اُن کی روزمرہ
 زندگی میں سرایت کر گیا۔ شہروں اور قصبوں میں کئی ہوٹل اور قهوہ خانے گھلنے سے لوگوں کی

تفریحی زندگی کا باب بھی شروع ہو گیا۔ اس فتح کی جگہ میں عام لوگوں کی تففتح کے علاوہ ادیبوں اور دانشوروں کی آماجگاہ بن گئیں۔ مصری سماج زندگی کے ہر شعبے میں مغربی علوم و فنون کی کامیابی کے ساتھ پیروی کرنے لگا۔ اب یہ وہ پُرانا د قیانوی سماج نہیں تھا بلکہ بیسویں صدی کا ایک جدید اور صحیت مند ترقی پذیر سماج تھا۔

دورِ حافظہ ابراہیم میں مصر کے ادبی حالات:-

جب کسی معاشرے میں سیاسی، سماجی، ثقافتی اور اقتصادی تبدلیاں رونما ہوتی ہیں تو اس کا اثر اُس وقت کے ادب پر پڑنا لازم ہے۔ کوئی بھی صحیت مند تبدلی ادب کو جدت کی طرف لے جاتی ہے کیونکہ جب حالات کروٹ لیتے ہیں تو علوم کی نئی راہیں کھلتی ہیں۔ معاشرے کی سوچ اور غور و فکر کے انداز بدل جاتے ہیں۔ یہی نئی راہیں نئی سوچ اور نئے خیالات، نئی تخلیقات کو جنم دیتے ہیں۔

مصری عربی ادب کی جدیدیت یورپی اقوام کی مرہون منت ہے۔ ویسے بھی اگر ہم ایمانداری سے تجزیہ کریں تو یہی سچائی ثابت ہوتی ہے کہ یورپی اقوام کا مشرق پر تسلط صرف سیاسی طور سے ہی نہیں بلکہ سماجی اور معاشرتی اعتبار سے بھی قوموں کے لئے ایک انقلاب کا باعث بنا ہے۔ کیونکہ اس سے مشرقی قوموں پر جمود اور تاریکی کے دھنڈ لکے چھٹے اور لوگ متحرک اور فعل ہونے لگے۔

جاگیر دارانہ نظام اور سوچ پُرانی داستانوں کی طرح کتابوں کے اور اق کی زینت بن گئے۔ زندگی نئے راستوں پر نئے ارادوں اور حوصلوں کے ساتھ ایک خوش گُن تصور کے ساتھ آگے بڑھنے لگی۔ لوگوں کا تصور، نظریہ اور خیال نئے زمانے کے ساتھ میل کھاتے ہوئے بد لئے لگا۔ زندگی کی گُلچیوں کو نئے زاویوں سے دیکھا اور پرکھا جانے لگا۔ سوچ کی اڑان، ذہن کی بالیدگی اور خیالات کی گُشادگی نے سمندر پار کے نظریوں کو بہ آسانی قبول کیا۔

فلک نے جو نہیں دور بدلات تو انساں بھی بدل گئے۔ نئے خیالات اور نئے نظریے اصلاح کی تحریکوں کا باعث بنے۔ ادب کے گلستان میں بھار آگئی۔ شعر و ادب کی نئی کونپیس پھوٹنے لگیں۔ ادب کی سر زمین پر شعر و ادب کو زندگی کے ترجمان کی حیثیت سے سوچا جانے لگا۔ اس کا مقصد قوم و ملت کے اصلاح کے طور پر رکھا گیا۔ ادب کا دامن اتنا وسیع ہو گیا کہ اسے برائے زندگی سمجھا جانے لگا۔ شعر اور ادب نے اور نزائل موضوعات کے پیرائے میں زندگی کے مسائل حل کرنے لگے۔ ظاہری حسن و زیبائش مفقود ہو گئی اور اُس کی جگہ موضوع اور مواد نے لی۔ جس سے نئی روایات نے جنم لیا۔

انیسویں صدی کے مشہور ادباء کی تخلیقات کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ حقائق فطرت سے چیزیں، نظم و ضبط، اتحاد و اتفاق، اصلاح احوال اور ماحولیاتی تعلیم کے عنصر عربی ادب میں یورپی علم و ادبی انقلاب کی دین ہیں۔ س، موریہ ان تبدیلیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

ترجمہ:-

”مغری اثرات نے عالم عربی کو چندایسی بڑی تبدیلیوں سے دوچار کیا جن کا دائرہ فوجی اور تکنیکی گوشوں سے نکل کر اقتصادی، معاشرتی اور ادبی میدانوں تک پھیل گیا۔ بہر حال آخری میدان جس میں مغربی اثر ظاہر ہوا وہ میدان ادب تھا۔ اس طرح فنون ادب میں آخری فن جو مغرب سے متاثر ہوا فنِ شعر ہے۔ عالم عربی نے اس دوران کی چیزیں دیکھیں مثلًا پرنگ پر لیں کی آمد، فوجوں کی تشكیل، جدید نئے اسکولوں کا قیام، مغربی زبانوں سے علمی و ادبی شہپاروں کے ترجمے، علمی و فوڈی یورپ روغنی، اسکولوں کی تاسیس، مغربی اسکولوں میں یورپی اساتذہ کی تیاری، اخبارات و رسائل کا پھیلاو، تھیٹر ہالوں، لابریریوں، عربی اکادمیوں کا قیام وغیرہ، ان تمام بالتوں نے نئے انداز سے عربی زبان و ادب پر توجہ و اہتمام کی راہ، ہماری کی۔“^۱

عربی ادب کی اس نشأۃ ثانیہ کے دور کے ادباء اور شعراء نے جاہلی اور عباسی دور کے کلاسیکی ادب کی تقلید کو اپنا شعار بنا کر، ادب کی معنوی خوبی کو اُس کے ظاہری حُسن پر فوقيٰت دے کر اسے جدید علوم و معارف سے روشناس اور فنيضياب کیا اور نئے تقاضوں و جدید رحجانات کو اپنے فن پاروں کی زينت بنایا۔ شعراً حضرات طرفگی اور نئے پن کے ذریعے اپنے عہد کے عکاس رہے۔ صنعتی انقلاب کے دوران ہونے والی نئی نئی ايجادات کی روشنی میں شعراً حضرات نے نئی تشبيهات سے اپنی شاعری کو آراستہ کیا۔ نئے اسلوب اور طرز نگارش کا چلن عام ہوا۔ لفظی بازگیری، منئ، ساقی اور پیانے کی تعریف و توصیف میں بے جان اور رکیک تشبيهات و استعارات کا سہارا لے کر دروغ گوئی اور آوارگی و فحاشی کے عناصر لگ بھگ مفقود ہو گئے بلکہ اس کی جگہ ادب میں مقصدیت کا عضر غالب ہونے لگا جس کا اثر عام آدمی کے ذہن پر پڑا۔ انفرادی رحجانات و ميلانات کی جگہ قومی افکار و نظریات کو اولین ترجیح ملی۔ ادباء نے اپنے ادب پاروں میں حدیثِ دل اور حدیثِ جہاں کو اپنا موضوع بنایا کہ عام آدمی کے اندر قومی شعورو احساس کی چنگاری جلا دی۔

کئی ادباء نے اصلاح احوال کی طرف توجہ دلانے کے لئے حقیقت پسندی اور نئی تہذیب کا سہارا لیا۔ انہوں نے اپنی قوم کو عملِ پیغم اور یقینِ محکم کے ساتھ ساتھ مستقل جدوجہد کا پیغام دیا اور اُس سے آج اور کل کی فکر کرنے کا درس دیا۔ اس طرح کا ادب لوگوں کے اندر زندگی کے احساس، بلندی خیالات، مضبوط ہمت اور وسیع النظری کا موجب بنا۔

مغربی اثرات سے علمی، ادبی اور سماجی تبدیلیاں رونما ہوئیں جن کے پیش نظر شعراً حضرات نے شاعری کے قدیم موضوعات جیسے کہ مدح، ہجو، فخر اور نسیب و تشیب کو جدید خیالات

اور مضمایں کی شکل میں پیش کیا۔ مرثیہ اور نالہ شیون جیسے موضوعات کو وطنی و قومی خدمات کے لئے استعمال کر کے لوگوں کے قلب و نظر میں حرارت بھر دی۔ کئی مصری شعراء جیسے کہ بارودی، احمد شوقي اور حافظ ابراہیم نے مغربی قوموں کی ترقی اور ان کے سائنسی و اجتماعی علوم و آداب کی جدت طرازی کو سمجھتے ہوئے اسے جدید تشبیہات و استعارات سے مزیں کر کے اس میں جوش اور ولہ کے عناصر ملا کر ایسے دل فریب نغموں میں ڈھالا کہ قوم کے خوابیدہ ذہن کو بیدار کر کے ان کے شعور و احساس میں عزم و ہمت اور پامردی اور جاں سپاری کی آگ بھڑکا دی۔

جن محرکات نے مصری ادبی نشونما میں کلیدی رول ادا کیا ان میں چھاپ خانے کو اولین اہمیت حاصل ہے۔ اس ضمن میں ”مطبع بولاق“ اور دیگر قائم کئے گئے چھاپ خانوں نے قدیم عربی ادب کی نایاب اور انمول کتابوں کو طباعت کے زیر سے آراستہ و پیراستہ کیا جس سے اربابِ شعر و ادب مختلف جہتوں سے روشناس ہوئے۔

مختصرًا مصری عربی ادب نے دورِ حافظ ابراہیم میں بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر ان حالات کو اپنے اندر ایسے سموایا کہ نئے نئے اسالیبِ فن اور اصنافِ سخن معرض وجود میں آئے اور اس کی خارجی اور داخلی ہیئتوں میں انقلاب پیدا کر دیا۔

صلاح عبدالصبور اس پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

ترجمہ:-

”بے شک عربوں نے ان صدیوں میں وہ بات پائی جو ان کے پاس نہیں تھی۔

خصوصاً تخلیقی ادب کے میدان میں کلاسیکی دور میں عربوں کی تخلیقی صلاحیت صرف رومانوی

و غنائی شاعری یا نثر میں رسائل، خطابات اور مقامات تک محدود تھی۔ ڈرامہ اور ناول خواہ وہ

مختصر ہو یا طویل تک اس کی پہنچ نہیں تھی اور جب یورپی ادبیات کا کچھ حصہ عربوں کے درمیان در آیا تو انہوں نے اس میں ادب کی وہ فسمیں پائیں جن سے وہ آشنا نہیں تھے۔ انجام کار انہوں نے اس کی نقل کی اور اس طرح ان کی تخلیقی صلاحیت نے ترجمہ و تعریف اور نقل و اتباع کا راستہ اختیار کیا اور اس مرحلے تک پہنچ گئی جہاں ان ادبی اصناف کی مکمل فنی شکلوں کے ساتھ نمائندگی ہوتی ہے۔ تاکہ بعد کے ادوار میں ان اصناف کے قولب میں عربی مضمایں کو پیش کیا جاسکے اور اس طرح عربی ادب تقلید کی تنگ نائے سے نکل کر تجدید و ابتكار تک پہنچ گیا۔^۱

دورِ اقبال میں بر صغیر کی سیاسی حالت:-

علامہ اقبال کی پیدائش سے دو دہائیاں قبل ہی بر صغیر میں انگریزوں کے خلاف آزادی کا نعرہ بلند ہو چکا تھا۔ انگریزوں کی غلامی کے سوال برداشت کرنے کے بعد آخر کار انہوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ ملک کو انگریزوں کے چڑھل سے آزاد کر کے ہی رہیں گے۔

۱۸۸۵ء میں جب آل انڈیا نیشنل کانگریس کی بنیاد ڈالی گئی تو علامہ اقبال تقریباً ۲۹ ر برس کے تھے۔ کانگریس کی بنیاد مملکہ و کٹوریہ کے عہد کے ”ریڈیکل“، اصول پر قائم کی گئی۔ اے او۔ ہیوم نے اس کی بنیاد رکھی جبکہ ڈبلیو۔ سی۔ بینز جی اس کے پہلے صدر تھے۔ اس پارٹی سے متعلق پہلے اجلاس میں یہ فیصلہ لیا گیا کہ ملک کے مختلف طبقہ جات اور امورات سے تعلق رکھنے والے افراد سے نزدیکی رابطہ اور تال میل بڑھایا جائے۔ ذات پات، رنگ و نسل اور علاقائی تعصُّب کو ختم کر کے قومی پیچھتی کو فروغ دیا جائے اور عوام کی فلاح و بہبود کے لئے لائجے عمل طے کیا جائے۔ اس وقت انڈین نیشنل کانگریس ایک ایسی قومی پارٹی تھی جس کا انقلابی طریقہ کار یا آزادی کی

جدوجہد سے دُور کا واسطہ نہ تھا بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ کس طرح سے ہندوستانی لوگوں کا انگریزی سرکار کے تین اعتماد بڑھایا جائے۔ سر سید احمد خان نے کانگریس کے مقابلے پر ۱۸۸۶ء میں ”علی گڑھ محدث ایجو کیشنل کانگریس“ کا انعقاد عمل میں لایا جس کے ابتدائی خطے کے دوران انہوں نے مسلمانوں کو اپنا تعلیمی معیار اونچا کرنے کی تلقین کی۔

انیسویں صدی کے آخر پر بال گنگا دھرتک، پن چندر پال اور اربندو گھوش نے اپنے منفرد جذبات اور خیالات کے ساتھ تحریک آزادی کو نیا جوش و جذبہ عطا کیا۔ انہوں نے ہندوستان کی معاشی بدحالی اور سماجی بے راہ روی کو انگریزوں کی دین قرار دیا۔ اسی دوران شدت پسندوں نے تحریک آزادی میں شامل ہو کر انگریزوں کو ہندوستان سے باہر نکالنے کے لئے کئی جگہوں پر تحریکی کارروائیوں کا آغاز کیا۔ ہندوستان کی تحریک آزادی میں شدت پسندی اور انہا پسندی کے پنے اور پھلنے پھولنے کی کئی وجوہات تھیں جیسے کہ (۱) بیور و کریسی کا ناقص نظام حکومت اور ان کا ظلم و ستم (۲) اقتصادی بے ضابطگیاں (ج) تعلیم یافتہ نوجوانوں کو روزگار فراہم نہ کرنا (۴) مذہبی جنون (ھ) برطانوی نوآبادیوں میں ہندوستانیوں کی حالت زار (و) عالمی سطح پر سیاسی تبدیلیوں کا اثر اور (ز) اعتدال پسند طبقے کا بھروسہ مند نہ ہونا وغیرہ۔

۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال کے بعد پورے ہندوستان میں انگریز سرکار کے خلاف غصہ اور نفرت کی لہر پھیل گئی۔ دراصل انگریزوں کا اس کے پس پشت مذہبی منافرت پھیلانے کا جذبہ تھا لیکن لوگوں نے ایک ہو کر اس کی مخالفت میں سودیشی تحریک کا آغاز کیا۔

۱۹۰۶ء تک برصغیر میں مسلمانوں کی کوئی بھی الگ سیاسی پارٹی نہ تھی اور شدت سے کئی حلقوں میں یہ ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ ایک ایسی سیاسی تنظیم ہو جو مسلمانوں کی قیادت کر

سکے۔ اسی خیال سے آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں لا یا گیا۔ اس جماعت کی بنیاد ریڈیکل یا ترقی پسند اصول کی بجائے کنز روپیٹو یا رجعت پسند اصول پر رکھی گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم عوام کے ساتھ مسلم لیگ کا کوئی ربط پیدا نہ ہوسکا۔ البتہ اتنا فائدہ ہوا کہ مسلمانوں کی علیحدہ نمائندگی کا اصول مان لیا گیا۔

ڈھاکہ میں مسلم لیگ کے قیام کے بعد مسلمانوں کی ایک اور سیاسی تنظیم ”احرار لیگ“ کا قیام عمل میں آیا جس کا مقصد ہر سطح پر اور ہر محاذ پر انگریزوں کے خلاف لڑائی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا تھا۔ اس بارے میں علامہ اقبال کے فرزند جاوید اقبال یوں رقمطراز ہیں:

”مسلمانوں کی سیاسی تاریخ کے اس دور میں جتنی بھی انجمنیں قائم ہوئیں ان کے مقاصد محدود تھے۔ وہ صحیح طور پر سیاسی انجمنیں کھلانے کی مستحق تھیں کیونکہ ان کا نصب اعین یا تو مسلمانوں میں جدید تعلیم کے فروغ اور حکومت انگلستان کے ساتھ وفاداری کا دم بھرنے تک محدود تھا یا وہ ہندو اکثریت کی بڑھتی ہوئی سیاسی قوت کے خلاف دفاعی محاذ کے طور پر وجود میں لائی گئی تھیں،۔۔۔“

ہندوستان میں ایک آزاد حکومت کے قیام کے لئے ریشمی رومال، کی تحریک کو جنگ آزادی میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ یہ تحریک دیوبند کے ناظم مولانا محمود الحسن نے شروع کی۔ اس تحریک کا منصوبہ یہ تھا کہ ترکی کی فوج افغانستان کے راستے ہندوستان پر حملہ کرے اور اُسی دوران پورے ملک کے مسلمان بغاوت کر کے ہندوستان کو آزاد کرالیں۔

۱۹۰۴ء میں انڈین نیشنل کانگریس دو حصوں میں بٹ گئی، ایک حصہ شدت پسند اور دوسرا

۱۔ جاوید اقبال، مئے لائفام، (مطبع علمی پرینٹنگ پریس بنارس۔ اشاعت دوم: ۲۱۹۶ء)، ص۔ ۷۸۔ ۷۹۔

اصلاح پسند کے نام سے جانا جانے لگا۔ اگلے ہی سال ۱۹۰۸ء میں شدت پسندوں نے پھر سے تحریب کاری کی کئی اور کارروائیاں انجام دیں۔ ۱۹۰۹ء میں مارے منظور یفار معمل میں لائے گئے جن کی رو سے کوئی کوئی کوئی کوئی جبکہ صوبائی سطح پر اور مسلم ممبر ان کی تعداد کو بھی بڑھایا گیا۔ ۱۹۱۳ء میں بیرون ملک رہنے والے ہندوستانیوں نے ”غدر پارٹی“ کی بنیاد ڈالی۔ اسی سال مسلم لیگ نے اپنے اجلاس میں کانگریس کے سیف روں کے نعرے کو بھی شامل کیا۔

۱۹۱۵ء میں مسلم لیگ اور انڈین نیشنل کانگریس کا مشترکہ اجلاس سببی میں منعقد ہوا جو کہ کافی کامیاب ثابت ہوا کیونکہ اگلے ہی برس دونوں پارٹیوں کے درمیان سمجھوتہ ہوا جو کہ تاریخی نوعیت کا سمجھوتہ تھا اور ”میشاقِ ملّی“ کے نام سے پُکارا گیا۔ اُسی برس مسزائی بیسٹ نے پورے ملک میں ”ہوم روں“ تحریک شروع کر دی۔

حالانکہ برصغیر میں مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی واحد سیاسی جماعت تھی لیکن اس پر انگریزوں کے فرمانبردار اور خدمت گزار مسلمان رئیسوں اور جاگیرداروں کا قبضہ تھا۔ یہ صرف اپنے مفادات کی حفاظت کرنا جانتے تھے جبکہ مسلمانوں سے ان کا کوئی سروکار نہ تھا۔ مولانا شبلی نے ایسے قسم کے سیاست دانوں پر طنز کے تیر بر ساتے ہوئے کہا کہ ان کا خیال مسلم قوم کو محض بی۔ اے۔ پاس کرنا یا نوکری دلوانا تھا۔ مولانا نے دو ٹوک الفاظ میں اس گروہ کو قیادت کے لئے نااہل قرار دیا۔ حالانکہ انہوں نے اس کی اصلاح کے لئے کئی تجاویز بھی پیش کیں لیکن ان پر کبھی عمل نہ کیا گیا۔ صرف اتنا اثر دیکھنے کو ملا کہ مسلم لیگ کے نوجوان طبقے کا اثر و رسوخ اور دبدبہ بڑھ گیا۔ اُن دنوں یہ نوجوان طبقہ مولانا محمد علی جیسے دلیر اور با غیرت جوانوں پر مشتمل تھا۔

یہ انہی جیسے نوجوانوں کی کاؤشوں کا شمر تھا کہ محمد علی جناح کے زیر قیادت مسلم اور ہندو سیاسی رہنماؤں کو ایک دوسرے کے مقابل بٹھا کر بیٹھا لکھنو کے لئے راہ ہموار کر دی لیکن پھر بھی مسلم لیگ اپنا دائرہ مقاصد و سعی نہ کر سکی اور اسی وجہ سے محمد علی جیسے در دمن در نوجوان نے مسلم لیگ سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور ۱۹۱۹ء میں خلافت مومن شروع کر دی۔

۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو پہلی جنگ عظیم کا خاتمه ہو گیا اور کانگریزوں کا ساتھ دینے کا صلہ روٹ ایکٹ کی شکل میں ملا، جس کو ناکام بنانے کے لئے گاندھی جی نے ستیگہ تحریک شروع کر دی۔ اسی سال بیساکھی کے دن جلیا نوالہ باغ کا قتل عام ہوا۔ ۱۹۲۰ء کو الہ آباد کی کانفرنس میں انگریزوں کو بھیج گئے خلافت کے مسئلے کو حل کرنے کے الٹی میٹم پر پورا نہ اُترنے کے سلسلے میں گاندھی جی کی قیادت میں پورے ملک میں تحریک عدم تعاون شروع ہوئی۔ ۱۹۲۳ء سے لے کر ۱۹۲۷ء تک کا عرصہ تحریک آزادی کے لئے سخت نقصان دہ ثابت ہوا۔ پہلے فرقہ وارانہ فساد ہوئے پھر کچھ لوگ گاندھی جی سے ناراض ہو کر تشدد کے راستے پر نکل پڑے۔ ۱۹۲۵ء میں کاکوری میں ڈرین سے سرکاری خزانہ لوٹا گیا۔ اس ڈیکیتی میں چار لوگوں کو پھانسی دی گئی۔ جس سے ”ہندوستان ری پبلیکن ایسوی ایشن“ تتر بترا ہو گئی لیکن بھگت سنگھ نے اسے پھر سے ”ہندوستان سو شلسٹ ری پبلیکن آرمی“ کے نام سے زندہ کیا۔ ۱۹۲۷ء میں برطانوی سرکار نے سائمن کمیشن کا اعلان کیا جس کا مقصد ہندوستان کا آئین بنانا تھا لیکن اس کمیشن میں کوئی بھی ہندوستانی ممبر شامل نہ تھا۔ کمیشن کے خلاف سخت مظاہرے ہوئے۔ اسی سال مسلم لیگ دو حصوں میں بٹ گئی۔ ۱۹۲۸ء میں لاالہ لاچیت رائے کی موت واقع ہو گئی۔ ۱۹۲۹ء میں مولانا ابوالکلام آزاد نے مسلم نیشنل پارٹی قائم کی۔ اسی دوران کی اور مسلم پارٹیاں جیسے کہ پنجاب کی

”احرار پارٹی“، خان عبدالغفار کی ”خدائی خدمت گار“ جماعت، لکھنوں کے شیعہ مسلمانوں کی ”شیعہ پیٹکل کانفرنس“، اور بلوچستان کی ”طن پارٹی“ وجود میں آئیں۔ یہ سبھی پارٹیاں اپنے موقف کے اعتبار سے کانگریس کی ہمنوا اور حمایتی تھیں۔ صرف پنجاب میں قائم کی گئی عنایت اللہ خان کی ”خاکسار“ پارٹی فوجی نظام قائم کرنے کے حق میں تھی، اس کے علاوہ کلکتہ کی ”مومن پارٹی“ اور بنگال کی ”پرجاپارٹی“ غریب مسلم کاشتکاروں کے حقوق کے تحفظ کے لئے بنائی گئی تھیں۔

اپریل ۱۹۳۴ء میں گاندھی جی نے ڈانڈی تک پیدل مارچ کر کے نمک کا قانون توڑا اور پورے ملک میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی۔ اسی سال مسلم لیگ کے الہ آباد اجلاس میں علامہ اقبال کی صدارت میں پہلی بار خود اقبال نے اصولِ پاکستان کا نظریہ پیش کیا۔ ۱۹۳۵ء میں بھگت سنگھ، سکھ دیو اور راج گرو کو پھانسی پر لڑکا یا گیا جس سے ہر جگہ انگریز سرکار کے خلاف نفرت انگیز مظاہرے شروع ہوئے۔ ۱۹۳۶ء ہی میں گاندھی ارون سمجھوتہ ہوا جبکہ انگلستان میں منعقد ہوئی دوسری گول میز کانفرنس ناکام ہوئی۔ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۳۸ء کے درمیان سینٹرل پچسلی ٹیو اسٹبلی اور ریاستی اسٹبلی کے انتخابات ہوئے۔ اس انتخاب میں کانگریس بڑی پارٹی کے طور پر اُبھری۔ لیکن دوسری طرف کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان وزارت کے بٹوارے پر سخت رسم کشی ہوئی جو کہ اختلاف اور بعد میں دونوں پارٹیوں کے درمیان سیاسی دراڑ کا سبب بنا۔ اپریل ۱۹۳۸ء میں علامہ اقبال اس دنیا سے رخصت ہو کر چلے گئے۔

۱۹۴۰ء کے لاہور اجلاس میں قیامِ پاکستان کی قرارداد منتظر ہو گئی۔ جس میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ شمال مغرب اور مشرق کے مسلم اکثریت والے حصوں کو لے کر ایک الگ ملک بنایا جائے۔ یہ تجویز ”پاکستان ریزولوشن“ کے نام سے مشہور ہوئی۔ ۱۹۴۲ء میں بمبئی میں ہوئے

کانگریس کے اجلاس میں ”بھارت چھوڑو“ کی تحریک منظور ہو گئی۔ پنڈت نہرو کے مطابق اس تحریک کے دوران پولیس کی گولی سے کم از کم دس ہزار لوگ ہلاک ہوئے۔

سبھاش چندر بوس نے ۱۹۳۲ء میں ”آزاد ہند فونج“ بنائی اور اگلے سال انہوں نے ہندوستان کی عبوری حکومت کا اعلان کر دیا۔ جب انگریز سر کار سمجھ گئی کہ اب وہ طاقت کے بل پر ہندوستان پر زیادہ دیر حکومت نہیں کر سکتی تو آخر کار دائسرائے نے ۱۶ اگست ۱۹۳۶ء کو کانگریس کو سر کار بنانے کی دعوت دی اور جواہر لعل نہرو کی قیادت میں عارضی حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ ۲۲ مارچ ۱۹۴۷ء کو لارڈ ماونٹ بیٹن نے ہندوستان کا بٹوارا ضروری قرار دیا۔ جون ۱۹۴۷ء کو اُس نے طے شدہ تاریخ سے پہلے ہی ہندوستان کی آزادی کا اعلان کر دیا۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہند کا فیصلہ کر لیا گیا اور اسی دن ہندوستان اور پاکستان دو آزاد ملکوں کی حیثیت سے وجود میں آئے۔

دورِ اقبال میں بر صغیر کی سماجی، ثقافتی و اقتصادی حالت:-

علامہ اقبال نے جس سماج اور ماحول میں آنکھ کھولی وہاں ہر طرف انگریزوں کا دور دورہ تھا۔ ملکہِ ازبٹھ ”قیصرِ ہند“ کا خطاب پاچکی تھیں۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کی ناکامی کے بعد بنگال سے لے کر اپنی تک مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ انگریزوں نے ہندوستانیوں کی بے عزتی اور ظلم کو ایک معمول بنالیا تھا۔ انہوں نے یہاں کے باشندوں کا سیاسی، سماجی اور معاشی استحصال جاری رکھنے کے ساتھ ساتھ ان کے مذاہب کو بھی نشانہ بنانا شروع کیا تھا۔ انگریزوں نے ایک سوچی سمجھی پالیسی کے تحت عیسائیت کو پھیلانے کا کام سرکاری طور پر شروع کر دیا۔ اس مشن کے تحت انہوں نے ہندو مت کی تعلیمات کو اپنے چھاپ خانوں میں چھپنے والی کتابوں میں بدل کر رکھ

دیا۔ جس سے انہیں اصلی اور غلط یعنی تبدیل شدہ تعلیمات میں شکوہ و شبہات پیدا ہو گئے جو کہ لوگوں کے اندر رخت انتشار کا باعث بنا۔

مندروں اور دیگر مذاہب کی عبادت گاہوں سے مسلک جا گیریں سرکار نے اپنے قبضے میں کر لیں۔ عیسائی مشنریوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنا مذہب اپنانے کی ترغیب دی جس کے عوض میں انہیں سرکاری نوکریوں اور ترقیوں کا لائق دیا جانے لگا۔

امریکن مشنری سوسائٹی نے آگرہ میں ایک چھاپ خانہ شروع کیا جس میں کئی ایسی کتابیں چھپ کر منظر عام پر آگئیں جو کہ بُت پرستی کے خلاف تھیں اور جن میں ہندو دیوی دیوتاؤں کو بُرا بھلا کھا گیا تھا اور ہندو مذہب کی توہم پرستی اور رسومات کو بے وقوفی اور علمی کہہ کر مذاق اڑایا جانے لگا۔

مسلمانوں کے خلاف بھی یہی سب کیا گیا۔ ان کی مذہبی آزادی پر قدغینیں لگائیں گے اور ان پر عیسائی مذہب تھوپنے کی کوشش کی جانے لگی۔ سرفیڈ لائنس کے مطابق:

”اٹھارہ سو سو تاون (۱۸۵۴ء) کی بغاوت کے بعد مسلمانوں پر انگریز اس

طرح ٹوٹ پڑے جیسے وہ ان کے اصل دشمن اور سب سے خطرناک حریف ہوں۔“^۱

اس کے علاوہ انگریزوں نے اپنی حکومت کے دوران ہندوؤں کے مذہبی اور سماجی معاملات میں دخل اندازی شروع کر دی جن سے پوری ہندو قوم چراغ پا ہو گئی۔

انہوں نے ستی کی رسم کا خاتمه کرنے کے لئے اس پر پابندی عاید کر دی۔ ہندو بیوہ کی دوسری شادی رچانے پر بھی سرکار نے منظوری دے دی۔ کسی آدمی کے مذہب کو تبدیل کر کے

^۱ عزیز برلنی: داستان ہند، (فرید بک ڈیپوریا گنج نئی دلی، سال اشاعت ۲۰۳۲ء)، ص۔ ۱۳

عیسائی مذہب اختیار کرنے پر بھی اُس کی آبائی جاسیداد میں اسے برابر کا حصہ ملنے کا قانون بھی پاس کیا گیا۔ اس کے علاوہ الگ الگ ذاتوں سے تعلق رکھنے والے قیدیوں کو ایک ساتھ کھانا کھلانا، ریل گاڑیوں میں سمجھی ذات کے لوگوں کا ایک ساتھ بیٹھنا، کارتوں میں گائے اور سور کی چربی کا استعمال وغیرہ ایسی باتیں تھیں جو کہ ہندو قوم کے سماجی و ثقافتی انتشار کا باعث بنیں۔

دورِ اقبال کا سماج الگ الگ مذاہب، طبقات اور ذاتوں میں بٹا ہوا تھا۔ مختلف مذاہب اور طبقات کے درمیان آپسی رقبابت بہت گہری تھی۔ اس رقبابت کے پچھے مذہبی، سیاسی، سماجی اور اقتصادی عوامل کا فرماتھے جو کہ کئی بار آپسی فسادات کا باعث بنے۔ اگر ہم علامہ کے دورِ حیات کی ہی بات کریں تو اس عرصے میں انگریزوں کے زیر قبضہ ہندوستان و پاکستان میں پچاس سے زائد مرتبہ مذہبی منافرت کے فسادات بھڑک اُٹھے۔

اس دور کے سماج میں لوگ، سرمایہ دار اور غریب، اونچی ذات اور نیچی ذات، جیسے طبقات میں منقسم تھے۔ سرمایہ دار غریبوں کا خون چوں کر اپنی دھن دولت کو دگنا کر رہے تھے جبکہ غریب دو وقت کی روٹی کے لئے ترستے تھے کیونکہ ان کے خون لپسینے کی کمائی کا زیادہ تر حصہ ساہو کاروں کے قرض اور سود چکانے اور سرکار کے تینیں لگان ادا کرنے کی نذر ہو جاتا تھا۔

تعلیم برائے نام تھی۔ ملک کی آبادی کا کم و بیش تین چوتھائی حصہ تعلیم سے بے بہرہ تھا۔ ہندو اور مسلمان اپنی اپنی تنگ نظری اور تعصب میں قید تھے۔ انگریزی تعلیم و تہذیب کے پھیلاؤ کو ہندو اور مسلمان اپنے اپنے مذاہب میں مداخلت تصور کرتے تھے۔ ہندوؤں میں کئی بُری رسماں جیسے کہ سنتی ذات پات، بیواؤں کو دوبارہ شادی کی اجازت نہ دینا، بچوں کی چھوٹی عمر میں شادی وغیرہ عام ہو چکی تھیں۔ کئی بُنگالی ہندو اور راجپوت لوگ لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی قتل کر

دیتے تھے۔ جس کو روکنے کے لئے بعد میں انگریز سرکار نے قانون کی منظوری دی۔ اسی طرح شراب، بُوابازی، بھیک مانگنا جیسی سماجی بُرا یاں عام ہو چکی تھیں۔

مسلمانوں کی بھی یہی حالت تھی۔ تعلیم کی عدم حصولیابی نے انہیں جاہل بنادیا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ انگریزی تعلیم پڑھنے سے وہ مرتد ہو جائیں گے۔ سماج میں ان کا رویہ مدافعانہ تھا۔ انگریز لوگ منجملہ طور پر سمجھی ہندو مسلم لوگوں کو اپنے سے کمتر سمجھتے تھے وہ انہیں سماجی طور پر بھی کچھڑا ہوا مانتے تھے اور ان کے ساتھ حاکمانہ بر تاؤ کرتے تھے۔ الغرض ہندو مسلم دونوں قومیں غلامانہ زندگی بسر کرتی تھیں۔

”علماء اقبال بر صغير کے وہ پہلے شاعر تھے جنہوں نے ہندوستان میں وطنیت کے جذبے کو فروغ دیا۔“^۱

انہوں نے قومی گیت ”سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا“ لکھ کر سمجھی ہندوستانیوں (بلالحاظِ مذهب و ملت) کے دلوں میں وطن کے لئے پیار، محبت، جذبہ اور جوش بھر دیا۔ انہوں نے اپنے وطن کے سبزہ زاروں، کوہ ساروں، وادیوں، آبشاروں اور دریاؤں کی خوبصورت الفاظ میں تعریف کر کے وطن کے تصور کو روح کی گہرائیوں میں بساایا اور اس کے تیئیں عقیدت اور درکو دل کے اندر جگایا۔

ان کی شاعری نہ صرف وطن کی محبت جگانے کے لئے اکسیر ثابت ہوئی بلکہ انہوں نے شاعری کے ذریعے آپسی بھائی چارے کو مضبوط کرنے اور نفرت اور کدو رت مٹانے پر زور دیا۔^۲

مذهب نہیں سکھا تا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستان ہمارا

^۱ جاوید اقبال، زندہ روڈ، حیات اقبال کا تشكیلی دور، (مطبوعہ: غلام علی پبلیشورز لاہور، اشاعت اول ۹۷۶ء) ص ۹۲۔

دورِ اقبال میں اگر ہندوستان کی اقتصادی حالت کا جائزہ لیا جائے تو یہ عیاں ہوتا ہے کہ پورے طول و عرض میں غربت کا دور دورہ تھا۔ اُنیسویں صدی کی ۱۸۰۰ء کی دھائی میں پورے ملک میں صرف ۲۰، پیٹ سن کی ملیں اور لگ بھگ ۵۶ کوئیلے کی کانیں چل رہی تھیں۔ ۱۸۹۵ء میں ملتوں کی تعداد ڈبڑھ گئی اور کوئیلے کی کانوں کی تعداد دو گنی سے بھی زیادہ ہوئی حالانکہ ان میں سے زیادہ تر ملیں انگریز سرمایہ دار ہی چلاتے تھے۔

اوپری سرکاری نوکریاں انگریزوں کے لئے مخصوص تھیں۔ ہندوستانیوں کے لئے فوج میں ”صوبے دار“ اور سول انتظامیہ میں ”امین“ کے عہدے تک پہنچنا طے کر دیا گیا تھا۔ اس کے آگے اُن کی ترقی کے سبھی راستے مسدود کر دیئے گئے تھے۔ ہندوستانیوں کی تنخوا بھی ساٹھ ستر روپے ماہانہ سے زیادہ نہ تھی۔

انگریز سرکار ہندوستان کو برطانیہ کی منڈی کے طور پر استعمال کرتی تھی اور یہاں کی دولت سے انگلستان میں آرام و آسائش خریدی جاتی تھیں۔ خام مال کوڑیوں کے بھاؤ میں سپلائی کیا جاتا تھا جس پر کوئی بھی سہولیت میسر نہ تھی جبکہ اسی سے تیار شدہ مال ٹیکس سے لیس ہو کر ہندوستان میں داخل ہوتا تھا اور بھاری قیمتوں پر فروخت ہوتا تھا۔

پہلی عالمگیر جنگ کے دوران چونکہ غیر ملکی درآمدات کم ہونے، اندر وون ملک جنگ کے سلسلے میں حکومتی سطح پر شرح خرید میں اضافہ ہونے اور بیرون ملک جانے والے خام مال کی سپلائی بند ہونے سے قیمتیں اگرچہ اعتدال پر ہیں مگر دوسری جنگ عظیم کے دوران عام لوگوں کے لئے قحط کی سی صورتحال پیدا ہو گئی۔ کارخانہ داروں اور دیگر سرمایہ داروں نے غیر ملکی درآمدات کے بند ہونے پر عوام اور صارفین کو دودو ہاتھوں سے لوٹنا شروع کر دیا۔ ذخیرہ اندوزی، قیمتوں

میں اضافے اور کساد بازاری سے عام آدمی کی کمرٹوٹ گئی۔ اس ناجائز منافع خوری کا حساب کتاب رکھنے اور اس سے مزید نفع کمانے کے لئے بیمه کمپنیوں اور حصص بازاروں کا قیام عمل میں آیا۔ انگریز سرمایہ داروں نے ہندوستانی سرمایہ داروں کی ترقی کا گراف دیکھ کر ان کے ساتھ تجارت کی کئی شرکتیں قائم کیں۔

بیسویں صدی کے آغاز سے ہی ہندوستانی سماج کے رنگ ڈھنگ بھی تبدیل ہونے لگے۔ ہندوؤں میں مغربی تعلیم و تہذیب کے پھیلاوے نے کئی سماجی اور مذہبی تحریکوں کو جنم دیا۔ ان میں آریہ سماج، برہمو سماج، پرا رتھنا سماج اور تھیوسوفیکل سوسائٹی قابل ذکر ہیں۔ ان تحریکوں سے وابستہ پڑھے لکھے لوگوں نے عام لوگوں کو ترقی پسند خیالات سے روشناس کیا اور دقیانوں کی خیالات اور فضول رسومات سے نجات دلائی۔ مسلمانوں میں بھی کئی سماج سُدھار تحریکوں کی شروعات ہوئی۔ جن کا مقصد مسلم قوم کو مغرب کے ترقی پسند خیالات سے بہرہ ور کرنا، سماج میں پھیلی بُرائیوں کا قلع قمع کرنا، عورتوں کو سماج میں جائز مقام دلانا، پیری مریدی کے استھصال سے بھولے بھالے لوگوں کو بچانا وغیرہ شامل تھے۔ پڑھائی کے شعبے میں سر سید احمد خان نے ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ میں انیگلو مسلم اسکول کی شروعات کی جہاں پر مغربی ادب، آرٹ، سائنس اور دینی علوم کی تعلیم دی جانے لگی۔ جلد ہی یہ ادارہ مسلم قوم کے اندر تہذیبی اور مذہبی و تعلیمی بیداری لانے کا مرکز بن گیا جو کہ بعد میں ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں سامنے آیا۔

دورِ اقبال میں برصغیر کے ادبی حالات:-

دورِ اقبال میں اگر دبستان ادب میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا ذکر چھپیا جائے تو اس ضمن میں شعروادب کے حوالے سے نشی اُردو میں نئی تبدیلیوں کی شروعات ”تہذیب الاخلاق“ کے

ذریعے ہو چکی تھی۔ ستر (۷۰) کی دہائی میں اردو شاعری نے ایک نئی کروٹ، ایک نیا موڑ لیا جس کا سب سے پہلا اثر پنجاب میں منعقد ہونے والے مشاعروں پر ظاہر ہوا۔ ان مشاعروں میں حُسن کی جلوہ تابانیاں، عشق کی شوخیاں و عشوه طرازیاں اور ان سے مسلک دوسرے خیالات کے آہ و فغال لگ بھگ مفقود ہونے لگے۔ اس تبدیلی کا سہرا مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا حافظ کے سر بندھتا ہے۔ مولانا آزاد نے ”نجمنِ پنجاب“ کے نام سے علمی و ادبی سوسائٹی قائم کی جس میں انہوں نے اپنا جدید نظریہ شعر پیش کیا اور نئے طرز اور نئے انداز کی شاعری کے دور کا آغاز کیا۔ اس دور میں مناظرِ فطرت اور اخلاقی و اصلاحی موضوعات پر نظم کرنے کا چلن عام ہوا۔ مولانا آزاد نے تشبیہ و ترصیع کے بجائے تمثیل نگاری اور سلسلہ زبان سے نظم کا نیا شعری پیکر بنایا۔

ڈپٹی نذیر احمد نے ۱۸۶۹ء میں ”مرأة العروس“، لکھ کر ناول نگاری کی بُنیاد ڈالنے کا سہرا اپنے سر باندھا۔ انہوں نے اپنے مشن یعنی معاشرتی زندگی کو اخلاقی بُرا یوں سے پاک و صاف کرنے کے لئے کئی ناول لکھے۔ اُن کے ناول مکمل اصلاحی تھے اور اُن کی تحریر ایک خوش گُن واعظ کا بیان۔ اُن کی کاؤشوں نے ناول نگاری کے فن کو قبول عام بخشنا۔ مولانا عبدالحکیم شررنے مولوی نذیر احمد کے مشن کو آگے بڑھاتے ہوئے اپنی ناولوں سے مسلم امت کو اپنے ثقافتی و رثے کی جانکاری اور احساس دلایا۔

بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں پرمیم چندا ایک افسانہ نگار اور ناول نگار کی حیثیت سے اُبھرے اور ادب کے آسمان پر چھا گئے۔ انہوں نے ایران و توران کے قصوں کو چھوڑ کر اپنے ہی مال سے اپنی دکان سجائی۔ انہوں نے اپنے زورِ قلم سے کسانوں کی بدحالی، ساہو کاروں کے ظلم اور ہندوستان کے غریب طبقے اور دیہاتی زندگی کی بڑے ہی حسین انداز میں عکاسی کی۔

آزاد و حآلی کی کاوشوں کو دوسرے لوگوں کی تجربہ پسندی کے طفیل آگے بڑھنے کا موقع نصیب ہوا اور یوں پہلی بار شاعری طرحی مصروعوں کی صنای سے آزاد ہو کر موضوعی مشاعروں کی ڈگر پر چل پڑی اور وسعت پانے لگی۔ اس روایت کی توسعہ میں جن شعراء کا عمل دخل ہے اُن میں شیخ نظم طباطبائی، شوق قدوالی، اسماعیل میرٹھی، چکبست لکھنؤی، اکبر الہ آبادی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مولانا شیخ کی قومی نظموں، تاریخ و تمدن اور اسلامی علوم و فنون پر منی نشری تحریروں نے بر صغیر کے مسلمانوں کو مایوس اور احساسِ کمتری سے باہر نکال کر جینے کی تمنا جگائی اور ساتھ ہی نیا حوصلہ بخشنا، اُنہوں نے اُردو ادب میں تاریخ و سیرتِ زگاری کے لئے راہ متعین کی۔ مہدی افادی نے اُنہیں ”معلم اول“ کہا جبکہ دوسرے نقادوں نے اُنہیں ایک ”زلا انشاء پرداز“ قرار دیا ہے۔ اکبر الہ آبادی نے اُردو میں اعلیٰ درجے کی ظرافتِ زگاری کی بُنیاد ڈالی۔ جب مشرقی اور مغربی ہواوؤں کا آپسی تصادم ہو رہا تھا تو اکبر تین تھا ایک جیا لے سپاہی کی طرح مشرقی تہذیب و روایت کی شمع کو مغرب کے تیز و تند جھونکوں سے بچا رہے تھے۔

مولانا حآلی نے شاعری اور نثر دنوں میں انقلاب برپا کر دیا۔ اُنہوں نے نظمِ جدید کو ایک نئی زندگی عطا کی۔ ان کے قلم سے نکلے ہوئے ادبی شاہکاروں ”مقدمہ شعروشاوری“ اور مسدس ”موجز الاسلام“ نے شعراء ادب اور ملی رہنماؤں کو چھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اُنہوں نے خلیج بنگال کے نیلے پانیوں سے لے کر پنجاب کے لہلہتے کھلیاں تو تک پھیلے ہوئے ادب اور شعراء کو ادبی بیداری اور ادب شناسی سے آراستہ کیا اور یوں اُن کی مناجات قبول ہو گئی:

اے خاصہ خاصانِ رسول وقتِ دعا ہے
امت پہ تیری آکے عجب وقت پڑا ہے

مولانا حالی نے اپنی نظموں سے مسلم قوم کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا۔ انہوں نے اپنی نظموں کے ذریعے اسلامی نظریہ حیات کے تحت اخلاقی تعلیم دی۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے مطابق:

”حالی نے قوم کی زبوبی کے پیش نظر اسلاف کے کارنا موس کو بڑی اہمیت

دی تھی اور ماضی کے ساتھ اپنا تعلق قائم کر کے حال کو بہتر بنانے پر عوام کو اکسایا تھا،^۱

وہ مسلمانوں کے زوال پر آنسو بہاتے ہوئے اُن کی ذہنی، معاشرتی، ثقافتی و سیاسی زبوبی کی داستان سناتے رہے۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ اُنیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں وہ یکا یک خوابِ غفلت سے بیدار ہو کر اپنی سیاسی شکستہ پائی، اقتصادی خستہ حالی، تعلیمی پسمندگی اور اپنے تشخص و احیائے ملّتی کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔

عہدِ اقبال میں اُن کے ہم عصر شعراءً اصغر فاتی، جگر، فراق، عزیز لکھنؤی، صفحی لکھنؤی، سرور جہاں آبادی، چکبست، نادر کا کوروی، جوش ملیح آبادی وغیرہ نے غزل کی صنف کے لئے نیا شعور نیا آسمان اور نئی زمین ڈھونڈی اور اسے حُسن و عشق کے محدود دائرے سے نکال کر اس میں زندگی کے کئی دوسرے بہلوؤں کو پیش کر کے اسے روایتی حصار سے باہر نکالا اور اپنے عہد کے اُبھرتے ہوئے تقاضوں کا ترجمان و عکاس بنایا۔



☆.....دوسرا باب

دورِ اقبال اور حافظہ البرائیم

میں

اُردو و عربی شاعری

.....دورِ حافظہ البرائیم میں مصر کی جدید عربی شاعری کے موضوعات، مضامین اور اسالیب

.....دورِ اقبال میں برصغیر میں اُردو شاعری کے موضوعات، مضامین اور اسالیب

دورِ حافظ ابراہیم میں

مصر کی جدید عربی شاعری کے موضوعات، مضامین اور اسالیب

”جدید عربی شاعری“ کی اصطلاح اپنے لغوی معنی کے عین منافی ہے۔ اس سے مُراد عربی کی جدید زبان نہیں بلکہ زمانی اعتبار سے عہدِ جدید ہے۔ عربی زبان، ہی وہ واحد زبان ہے جو ابتدا سے لے کر آج تک اپنی بُنیادی ساخت اور الفاظ پر قائم رہتے ہوئے ترقی کی راہ پر گامزد ہے۔ انیسویں صدی کے نصفِ اول کی عربی شاعری پر اگر نظر دوڑائی جائے تو اُسے خالصتاً روایتی اور تقلیدی قرار دیا جائے گا۔ دراصل ادب کی تجدید تبھی ممکن ہے جب قوم معاشری فارغ البالی اور شخصی آزادی سے ہمکنار ہو۔ جہاں شخصی آزادی سلب ہو چکی ہو، عوام بدحالی کا شکار ہوں، اظہارِ ذات کی خواہش نہ ہو، شاعرانہ احساس نہ ہو، ہاں شعر و ادب میں کسی قسم کی تبدیلی ممکن نہیں۔ مگر عربی زبان و ادب پر یہ جمود زیادہ دیری تک برقرار نہ رہا اور اسی صدی کے نصفِ ثانی میں تجدید کی کوششیں پھوٹنے لگیں۔ اس کے پچھے کئی عناصر کا فرماتھے۔

قومی شعور کی بیداری سب سے بڑی اور بُنیادی وجہ تھی۔ اس کے علاوہ علوم و فنون کی ترقی کی وجہ سے مصر کے لوگوں کو اپنی قدیم تاریخ اور تہذیب و تمدن کی شاندار روایات کا عالم ہوا اور ساتھ ہی ساتھ قومی و سیاسی حقوق کی پامالی کا احساس بھی رگ و ریشمے میں سرایت کر گیا۔

اسی زمانے میں طباعت کے جدید انتظامات نے عربی کے قدیم ادبی سرمائے کو تسب و جراحت کی صورت میں منظر عام پر لا لیا۔ جس سے عام و خواص کا ادبی مذاق بد لئے لگا۔ دواوین کی

اشاعت کے علاوہ مغربی شعروادب کی تعلیم نے بھی ذوقِ سلیم کی تشكیل میں حصہ لیا۔ قدیم عربی اور جدید مغربی عناصر کے امتزاج سے ایک نیا ادبی معیار و مذاق پیدا ہو گیا اور شعراء کے یہاں ایک کشمکش کا احساس جا گزیں ہو گیا۔ صنائعِ بدالع کے چکر سے آزاد ہو کر حرکت و حرارت سے آشنائی ہوئی۔ آزادی کے خوش گُن تصور کے ساتھ عزت و کرامت اور اپنے وجود کا احساس، امیدوں اور آرزوؤں کی تکمیل کا باعث بنے لگا اور یوں عربی ادب کا جدید اعلیٰ قدروں کی طرف سفر شروع ہو گیا۔

عثمانی دور کا ادب بھاری پابندیوں کی وجہ سے اپنے دور کی حیات و شخصیات کی تصویر کشی کرنے سے معذور رہا۔ کیونکہ اس دور کے ادب پر سیاسی حقوق اور ذاتی آزادی کی قدغن لگائی گئی تھی اور یوں اس دور کا ادب مکمل طور پر محمود کاشکار ہو چکا تھا۔

بقول شوقي ضيف:

”هم انسیوں صد کے نصفِ آخر کو“ عصرِ لا صلاح ”یا“ عصرِ محاولة لا صلاح ”یعنی اصلاح کی کوششوں کے دور کا نام دے سکتے ہیں“۔^۱ دراصل اس دور میں فکری، عقلی اور روحانی انقلاب نمودار ہوا اور شعراء کا ایک ایسا گروہ نمودار ہوا جو شاعری میں سابقہ ذرخیز شعری روایات کی تجدید کرنا چاہتا تھا۔ اس ضمن میں کئی شعراء جن میں محمود صفوت ساعاتی، علی ابوالنصر، عبد اللہ فکری، علی اللیشی، عبد اللہ ندیم اور عائشہ تیموریہ نے اپنی شاعری کے ذریعے شعری روایات میں جدّت لانے کی طرف اہم کردار ادا کیا لیکن پھر بھی صنائعِ بدالع کی پُر تکلف صنعتیں اور خماسیات و تضمینات کی بیڑیاں جو پہلے بھی شاعری میں

۱ ڈاکٹر شوقي ضيف، جدید عربی ادب: مترجم ڈاکٹر بشنس کمال الحجم، (الكتاب انٹریشنل نی دلی۔ سال اشاعت: جنوری ۲۰۰۵ء)، ص۔ ۸۱

وسیلہ کا کام کرتی تھیں، ابھی تک کسی نہ کسی انداز میں عربی شاعری کو جکڑے ہوئے تھیں۔

بارودی.....جدید عربی شاعری کا مجدد:

علی پاشا کے دور حکومت کے آخر میں عربی شاعری کی گم شدہ فصاحت و بلاغت اور زور بیان کی نشانہ ثانیہ کا ظہور عمل میں آیا۔ یہ دراصل محمود سامی البارودی (پیدائش: ۱۸۳۸ء وفات: ۱۹۰۲ء) جیسے منفرد اور بے مثال شاعر کی ولادت تھی۔ جنہوں نے عربی شاعری کو اس سطح پر لایا کہ متنبی اور شریف رضی کے بعد صدیوں ویران پڑے بخیر سر سبز ہونے لگے۔ عربی شاعری کو جس شخص کی تلاش و جستجو تھی وہ رنگ لائی اور صنائع بداع کی قدیم و پُر تکلف صنعتوں میں ملبوس عربی شاعری کو ایک نئی جہت ملی۔ محمود سامی البارودی نے عربی شاعری کو اس قدر لچک پ بنایا کہ قاری کو حقیقی لذت کا احساس ہونے کے ساتھ ساتھ قلب و نظر اور جذبہ و احساس کو بھی غذا میسر ہوئی۔

بارودی کی شاعری نہ صرف اپنے قوم کی سیاسی خواہشات کی زبان بن گئی بلکہ اس نے سیاست میں چھپی خرابیوں اور کمزوریوں پر واپسی بھی کیا۔ انہوں نے ایک طرف زندگی میں پیش آنے والے عظیم واقعات کی تصویر کشی کی تو دوسری طرف عظمتِ رفتہ کی ایسی تصویر کھینچی کہ ماضی و حال کا موازنہ بہترین انداز سے کیا۔ اُن کے نزدیک شاعری کا مقصد، بقول ڈاکٹر فوزان:

”تَهذِيبُ النُّفُوسِ وَ تَدْرِيبُ الْأَفْهَامِ وَ تَنْبِيَهُ الْخَوَاطِرِ إِلَى مَكَارِمِ الْأَخْلَاقِ“

یعنی نفوس انسانی کو مہذب بنانا، فہم و ذہن کو مشتاقد بنانا اور اعلیٰ اخلاقی قدرتوں کی طرف دل کو متوجہ کرنا تھا۔^۱

بارودی نے عربی شاعری کو رکیک اسلوب نگارش سے چھکارا دلا�ا اور اس میں اپنے حسین و دلفریب انداز میں قومی روح ڈال کر اسے اپنے دور اور قوم کے جذبات و احساسات

۱۔ ڈاکٹر فوزان احمد، جدید عربی شاعری، (ادارة البحوث الاسلامية، جامعة سلفیہ بنارس۔ سِن اشاعت مئی ۲۰۰۸ء)، ص۔ ۳۸

سے ہم آہنگ کر دیا اور یوں ان کی روزمرہ زندگی سے تعلق رکھنے والے حادثات و واقعات کا حقیقی ترجمان بنادیا۔

اس ضمن میں ایک ایسی جماعت کے ظہور پذیر ہونے کا ذکر کرنا لچکسی سے خالی نہ ہوگا جو کہ فصح و بلغ عربی کی بجائے خالص مصری یعنی عامیانہ مزاج کی حامل تھی۔ اس جماعت کے روح رواں محمد عثمان جلال تھے۔ یہ جماعت مصری ادب کو مصری مزاج میں ڈھالنے کے حق میں تھی۔ عثمان جلال اور اس کے ساتھیوں نے اس نیت سے یہ نیا تحریب کیا کہ فصح عربی کے بجائے عامیانہ بولی میں اپنے جذبات و احساسات کو اشعار کی صورت میں پیش کیا جائے تاکہ عربی زبان بھی یورپ کی علاقائی زبانوں کی طرح پائیدار ہو جائے۔

اس سلسلے میں انہوں نے اپنی کاؤشوں کے تحت کچھ یورپی تخلیقات کا عامیانہ بولی میں ترجمہ کیا، جو نشر کی حد تک تو کم و بیش مناسب ہی تھا لیکن شعرو شاعری کے میدان میں یہ رجحان کامیاب نہ ہو سکا۔ کیونکہ اس سے عربی لوگ اپنی قدیم ثقافت سے دور ہو رہے تھے جس پر انہیں بے حد ناز تھا اور جس کی دُوری انہیں کسی قیمت پر گوارہ نہ تھی۔ دوسرا ہم پہلو یہ تھا کہ قرآن کی زبان سے دور ہو کر مصری اور دیگر عربی قوموں کے درمیان دُوری پیدا ہو رہی تھی۔ علاوہ ازیں یہ بھی کہ بارودی اور اس طرز کے شعراء نے یہ ثابت کر دیا کہ عربی زبان میں پائی جانے والی کمزوری کا اصل سبب زبان کا حقیقی ضعف نہیں بلکہ اس کے صاف و شفاف اور شاندار اسلوب نگارش سے عدم واقفیت ہے۔ اس کو مزید تقویت دینے کے لئے شیخ حسن مرفی نے اپنی مشہور کتاب ”الوسیلة الا دیۃ“، لکھی جس میں انہوں نے عربی زبان، نحو، بلاغت اور عروض کے قواعد کو کلاسیکی مثالوں سے آراستہ و پیراستہ کر کے بالکل نئے انداز میں پیش کیا اور حسب موقع و

محل جا، ملی، اسلامی و عباسی عہد کے تقریباً ہر شاعر کے عمدہ کلام سے استدلال کیا اور یوں کلاسیکی شاعری کے فطری اور فنی نمونوں کو عام کیا۔

انہوں نے بارودی کی بے حد تعریف کی اور اُسے مذکورہ شعر آپر فو قیت دینے کی کوشش کی۔ مزید یہ کہ انہوں نے شعر آ کی ذہن سازی کرتے ہوئے انہیں بارودی کا اسلوب اپنانے کی ترغیب دی۔ اس سے یہ اثر ہوا کہ اُس وقت کی نئی نسل کے کئی شعر آ بالخصوص شوقي و حافظ ابراہیم جیسے نوجوان شعر آ کو یہ اسلوب بہت پسند آیا۔ یہی نہیں بلکہ شعر آ مें مجر تک بھی اس اسلوب کی گونج پہنچ گئی اور خلیل مطران جیسا شاعر بھی اس اسلوب کا شیدائی بن گیا۔

شوقي، حافظ ابراہیم اور مطران نے بارودی کے اسلوب کی آبیاری کرتے ہوئے اسے چھٹنگی کی حد تک پروان چڑھایا۔ یہاں تک کہ آنے والی نسل نے انہیں ”حافظین“ کے لقب سے نوازا۔ ان تینوں شعر آ نے اسلوب کی فصاحت و بلاغت اور زور بیان جو کہ بارودی کی شاعری کا خاصہ تھے کامکمل طور تحفظ کیا۔ ان شعر آ نے نہ صرف اپنی تہذیب اور اپنے زمانے کی بھرپور ترجمانی کی بلکہ قدیم و جدید اسلوب بیان، زمانے کی روح اور ثقافت و تہذیب کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کے تین ان کی کاوشیں قابل قدر ہیں۔

جب ہم خلیل مطران کے دیوان کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ایک ایسے عظیم الشان عربی اسلوب کی جھلک ملتی ہے جسے فصاحت و بلاغت پر کوئی آنج آئے بغیر مغرب کے شہ پاروں کو آپ تک پہنچانے میں کوئی صعوبت پیش نہیں آئی۔ اُن کے طربیہ اور غنائی قصیدوں میں وجدانی کیفیت کا اظہار مغرب کے رومانی رجحان سے ملتا جلتا ہے۔ دوسری طرف جب اس کی رنج و حزن سے معمور شاعری فطرت پر منکس ہو جاتی ہے تو اسے بھی اپنے جذبات و احساسات کا

آنئینہ دار بنا دیتی ہے۔ خلیل مطران آن سر خیل شعر کی صفت میں شامل ہیں جنہوں نے جدید اسلوب کے بجائے اسلاف کے شعری اسلوب میں محاکاتی رجحان کو عربی شاعری میں راستہ کیا۔ شوقي نے پہلی مرتبہ عربی ”منظوم ڈرامے“ کا آغاز کیا۔ انہوں نے قدیم نمونوں پر طبع آزمائی کے علاوہ جدت نگاری کی بھی کوشش کی۔ لیکن آن کی تجدید ڈون کی یہ کاوش ہمیشہ عربی زبان کے فضیح و بلخ اور شاندار اسلوب کی حدود میں رہ کر ہوئی۔

ادب کے جدید عربی دور میں شعر امام فہم زبان و اسلوب میں شاعری کرنے لگے تاکہ عوام اسے سمجھ سکیں۔ وہ متوسط طبقہ اور پنجھی سطح کے لوگوں کے لئے اپنی شاعری قابل فہم بنانا چاہتے تھے۔ یعنی اُس زمانے میں شاعری سہل پسندی کی طرف گامزن ہو گئی تھی۔ جدید شعر اصراف عوام کے جذبات و احساسات کی شاعری کرنے لگے اور شاعر کے ذاتی خیالات و محسوسات پس منظر میں چلے گئے۔ کچھ ایسے شاعر بھی ہیں جو عوام کی ترجمانی میں فنا ہو گئے تھے، جیسے کہ شوقي۔

”اس کے دیوان میں اس کی ذاتی زندگی کی ترجمانی برائے نام ہے۔ وہ عوام کی ترجمانی میں اس طرح فنا ہو گیا تھا کہ اُسے ”شاعر غیر“ کے لقب سے موسم کرنا بھی درست معلوم ہوتا ہے۔“^۱

اس کے مقابلے میں خلیل مطران نے اگرچہ اپنی جماعت اور عوام کی شاعری تو کی مگر اس میں خود کو مکمل طور پر فنا نہیں کیا۔ وہ سماجی شاعر ہونے سے زیادہ وجود انی قسم کا شاعر تھا۔ اُس کی محاکاتی شاعری نہ تو ذاتی شاعری تھی اور نہ ہی غنائی کیونکہ اس قسم کی شاعری میں دوسروں کے جذبات کی عکاسی کی جاتی تھی اور یہ کسی نہ کسی موضوع سے متعلق ہوا کرتی تھی۔ اس میں مطران کو

۱۔ ڈاکٹر شوقي ضيف، جدید عربی ادب: مترجم ڈاکٹر پرشیش کمال انجمن (الكتاب انٹرنشنل جامعہ نگری، دہلی ۲۰۰۲۵)۔ سال اشاعت جنوری ۲۰۰۵ء، ص ۸۸۔

کامیابی نصیب ہوئی اور لوگوں نے اسے بہت سراہا۔

حافظ ابراہیم، مطران اور شوقي میں سے اگر کوئی شاعر عوام کے سب سے قریب ہے تو وہ حافظ ابراہیم ہے۔ حافظ ابراہیم دراصل مصری قوم کا وہ آئینہ ہے جس میں مصری سماج میں برپا ہونے والی سیاسی، سماجی، دینی اور معاشرتی تبدیلیوں کی ہو، ہو تصور چھکلتی ہے۔ انہوں نے عوام کے اندر رہ کر نشونما پا کر عوامی جذبات و احساسات کی بڑی ماہرانہ عکاسی کی ہے۔

بقول شوقي ضيف:

”حافظ ابراہیم کو ہم ایک ایسا شاعر تسلیم کرتے ہیں جو بیک وقت اپنی ذات اور عوام دونوں کا ترجمان ہے۔“^۱

بیسویں صدی کے اوائل میں قاسم امین کی تحریک آزادی نسوان جس میں عورتوں کو آزادی اور بے حجابی کی دعوت دی گئی تھی تاکہ عورتیں اپنے حقوق حاصل کر سکیں۔ اُس وقت کے سبھی شعراء نے اس تحریک سے مرتب ہونے والے اثرات کے حق یا مخالفت میں شاعری کی۔

اس کے علاوہ ”مغربی تہذیب کی طرف عربی میلان“، ”جدید علوم کی تعریف و تحسین“، ”یورپ کی مشینی وغیر مشینی اختراعات و ایجادات کا نقشہ“، وغیرہ وغیرہ جیسے موضوعات پر شعراء نے اپنا زور قلم آزمایا۔ جو بلاشبہ جدید عربی شاعری کی جدت طرازی اور ارتقاء کی دلیل ہے۔ حافظ ابراہیم و شوقي اور مطران کے علاوہ جن شعراء نے اپنے موضوعات اور اسلوب کے اعتبار سے بارودی اسکول کی ایتباع کی اور قومی و سماجی شاعری میں بارودی کے کلاسیکی اسلوب کی پیروی کرتے ہوئے جدید عربی شاعری کو ایک مقام بخشنا، اُن میں سے اسما عیل صبری، مصطفیٰ صادق راقی،

۱۔ ڈاکٹر شوقي ضيف، جدید عربی ادب، مترجم ڈاکٹر نثار شمس کمال جمعہ (الكتاب انترنشنل جامعہ لکنرنی ولی ۲۵۰۰)، سال اشاعت جنوری ۱۹۷۴ء، ص ص ۹۳-۹۶

احمد محترم، احمد الکاشف اور محمد عبداللطیف جیسے نام قبل ذکر ہیں۔

حافظ ابراہیم اور شوقي نے جدید عربی شاعری میں جس انداز سے عوامی جذبات کی ترجمانی اور معاشرتی، دینی اور سیاسی رحجان کی طرف شاعری کا رُخ کیا، وہ آج تک برقرار ہے۔ اس سلسلے میں شوقي ضیف کہتے ہیں:

”ترقی پسند شعراء نے جن میں حافظ و شوقي کا نام سرفہrst ہے، جدید عربی شاعری کے کارروائی کو بہت آگے بڑھایا اور ایک طرف وزن اور اسلوب میں قدیم عباسی اسلوب کی محافظت کی تو دوسری طرف ہمارے جذبات و محسوسات کا اظہار کیا۔ بہ الفاظ دیگر عربی شاعری میں قدیم شاعری کی تجدید کی اور اسے اس قابل بنایا کہ وہ ہماری روزمرہ کی زندگی کے مختلف گوشوں کی ترجمانی کر سکے۔“

درحقیقت اس سچائی کا اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ ترقی پسند شعراء نے جدید شاعری کی تاریخ میں مصر کو ایک عظیم رتبے سے سرفراز کیا اور اسے ادبی قیادت کے ایسے اونچے عہدے پر فائز کیا کہ جس کی تمنا مصر کو صدیوں سے رہی تھی۔ انہوں نے مصر کی شعری فضا کو امتیاز و تفویق سے منور کر کے ایسے انعام و اکرام سے سرفراز کیا کہ مصر کو تمام عرب ممالک میں ممتاز کر دیا۔

جماعت الدیوان / مدرستہ الدیوان:-

بیسویں صدی کے پہلے نصف حصے میں مصر میں ایک نئی پودھر پذیر ہوئی جوانگریزی اور دیگر مغربی ادبیات پر قدرے عبور کھلتی تھی۔ اس نئی جماعت نے یورپی ادب کے زیر اثر ترقی

۲ ڈاکٹر شوقي ضيف، جدید عربی ادب، مترجم ڈاکٹر نشیش کمال الحمد (الكتاب انٹرنشنل جامعہ نگرنسی دہلی ۱۹۰۲۵ء) اسال اشاعت جنوی ۱۹۰۵ء)، ص۔۸۹

پسند شعر اپر یہ اعتراض عاید کیا کہ وہ اپنی شاعری میں اپنی ذاتی زندگی اور فطرت و کائنات کے ترجمان بننے کے بجائے عام طرح کی زندگی کی تصویر پیش کرتے ہیں اور انسان کے اندر کے محسوسات اور کیفیات کا تذکرہ کرنے سے احتراز کرتے ہیں۔

شعر کے فہم اور تصور کے بارے میں اپنا نقطہ نظر پیش کرتے ہوئے اس نئی پودنے اپنا مافی اضمیر بیان کرتے ہوئے کہا کہ شاعر کو انسانی زندگی سے تعلق رکھنے والے خیروش، غم و انبساط اور فطرت کے اسرار و رموز کا ترجمان ہونا چاہیے۔ ان کے بقول شاعری انسانی جذبات و شعور کی تصویر کشی کا نام ہے، جو شاعر کی زبان سے نغمہ زن ہو کر اس کے آس پاس کی دُنیا سے اس کے ربط کی عکاسی کرتی ہے۔ یعنی جماعت انگریزی ادبیات اور اس کی غنائی شاعری سے متاثر تھی۔

یہ جماعت جس میں عبدالرحمن شکری، عبدالقدار المازنی اور عباس محمود العقاد شامل تھے شوقي، حافظ ابراہيم اور مطران کے بعد نئی نسل کی سُرخیل مانی جاتی ہے اور اسے جماعت اپلوکا مقدمہ اجیش مانا جاتا ہے۔ یہ نسل مغربی ثقافت سے آراستہ ہو کر درج ذیل امور پر متوجہ تھی:

”۱.....شاعری کو زندگی کے شور و شغب اور ذاتی تعبیر سے آزاد کرنے کی دعوت۔

۲.....قصیدے کے اندر وحدت عضویہ کی دعوت اس طرح کہ وہ مکمل فنی علم معلوم ہو۔

۳.....ایک قافیہ سے آزادی اور قافیوں کو متنوع بنانے یا چھوڑنے کی دعوت۔

۴.....معنی پر توجہ اور قصائد کے اندر فلسفیانہ افکار و تامل اور دل کی باتوں کو داخل کرانا۔

۵.....اشیاء کے خلاصے اور جوہر کی منظر کشی، اسی خلاصے پر توجہ اور عارضی حالات سے گریز۔

۶.....فطرت کی منظر کشی اور ظاہری حالات سے ورے جو کچھ ہے اس میں غوطہ زنی۔

۔۔۔۔۔ روزمرہ کی معمولی چیزوں کو لے کر ان کی ایسی فنی تعبیر پیش کرنا جس سے ان میں زندگی پیدا ہو جائے۔^۱
 شکری، مازتی اور عقاد نے مل کر ایک نوع شعری مدرسے اور رحجان کی بنیاد ڈالی جس نے
 عربی غنائی شاعری میں نئی روح پھونک کر اسے ترقی کی راہ پر ڈال دیا۔

شکری کی شاعری خاص کراس کے قصیدے انسانی جذبات و مفہومیں اور فطرت کی عکاسی
 کرتے ہیں۔ ان کی شاعری ایسے گھرے رنج والم کے ساتھ ان تمام اشیاء کی تصویر کشی کرتی ہے
 کہ اگر اسے کوئی نام دیں تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ رنج سے معمور رومانی شاعری ہے۔

قدیم عربی شاعری میں اس قسم کے رحجان کی جھلک عباہی دور کے شعراء ابن الرومی اور
 ابوالعلاء المعری کی شاعری میں پائی جاتی ہے۔ لیکن شکری نے اس رحجان کو انگریزی و فرانسیسی
 ادب کے رومانی رحجان سے اخذ کیا ہے۔ عبدالرحمن شکری پہلے عربی شاعر ہیں جنہوں نے اپنی
 شاعری میں جدید تجربہ کرتے ہوئے یہ نعرہ دیا کہ کوئی بھی اسلوب خالص شعری اسلوب نہیں۔
 انہوں نے نہ صرف بارودی اور دوسرے ترقی پسند شعراء کی قدیم شعری روایات کے تحفظ و احیا
 کی تنقید کی بلکہ انہوں نے مشہور و معروف عربی اسالیب کی بھی پابندی نہ کی۔ انہوں نے
 قافیے میں جدت کی اور ایسے قصیدے کہہ جن کے ہر دوسرے شعر میں قافیہ بدل جاتا ہے۔
 انہوں نے ایک اور جدید طرز کی شاعری ایجاد کی جسے مغرب میں Blank Verse یعنی نظم
 معری اور عربی میں ”الشعر المُرسَل“ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ جس میں شاعروز ن کا تو
 پابند ہوتا ہے لیکن قافیے کی پابندی ضروری نہیں۔

مجموعی طور پر شکری کی شاعری نے زبان و بیان، قافیے اور موضوعات و رحجان کے اعتبار

۱۔ ڈاکٹر نوزان احمد، جدید عربی شاعری، (ادارۃ البحوث الاسلامیہ جامعہ سلفیہ بیnar)، سن اشاعت مئی ۲۰۰۸ء مطبع سلفیہ آفسیٹ وارانسی، ص۔ ۳۵۸۔

سے مصر کی قدیم وجہ دیدشاعری میں ایک انقلاب برپا کر دیا اور اسلوب و قوافی کی تمام بندشوں کو توڑ کر محسوسات کی تصوری کشی کا ایک نیا رجحان پیدا کر دیا۔ ناقدین نے شکری کی شاعری کے خصائص لکھتے ہوئے کہ انہوں نے قدیم اسلوب کے تسلط سے آزادی پر زور دیا ہے۔ اسی لئے ان کے اشعار کو ”خبری نظم“ کا نام دیا گیا ہے۔ بقولِ ڈاکٹر فوزان احمد، انہوں نے:

”قافیہ کے خلاف بغاوت کی ہے اور مرسل اشعار اور ابیات نظم کئے ہیں۔ اسی

لئے انہیں مرسل شاعری کے علمبرداروں میں شمار کیا جاتا ہے۔^۱

عقاد اور مازنی نے بھی شکری کا اسلوب اپنایا۔ چونکہ دونوں شعراء تقدیز نگار بھی تھے اس لئے انہوں نے ترقی پسند اور کلاسیکی شعراء بالخصوص حافظ ابراہیم اور شوقی کے اسلوب پر اپنے قلم کے نشتر چلائے۔ مازنی کے مطابق ان شعراء کا کلام ایک دوسرے سے مشابہ ہے کیونکہ یہ لوگ اپنے ذاتی احساسات کی عکاسی نہیں کرتے اور نہ ہی اپنے المناک درد کی نمائندگی کرتے ہیں۔

عقاد ایک نادر افکار ادیب و شاعر تھا۔ انہوں نے اپنے گرد و پیش کی ہرشے اور روزمرہ کے معمولی واقعات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ وہ ایک ایسے شاعر تھے جس نے پہلے اپنے مطالع کو ہضم کیا پھر ایسے جدید نمونوں کی تخلیق کی جن میں اس کے نفیسیاتی اور ذاتی افکار کی چھاپ تھی۔

تقدیز اور اختلاف سے پرے ہٹ کر ہم اس سچائی کے ماننے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے کہ مازنی اور عقاد کے جدید افکار و خیالات کی عربی جدید شاعری میں بڑی اہمیت ہے۔ کیونکہ یہ افکار نہ صرف ان کے جدید شعری رجحان کا تصور پیش کرتے ہیں بلکہ ان کے اور ترقی پسند شعراء کے رجحانات و میلانات کے درمیان پائے جانے والے اختلافات کی بھی وضاحت کرتے ہیں۔

^۱ ڈاکٹر فوزان احمد، جدید عربی شاعری، (ادارۃ الہجۃ الاسلامیۃ جامعہ سلفیۃ بن عباس۔ سن اشاعت میں ۲۰۰۷ء مطبع سلفیۃ آفیٹ، دارالحکم)

مدرسہ الدیوان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی شاعری میں مغربی اثرات کے علاوہ قدیم شاعری کے بھی بہت سے اثرات کی جھلک ملتی ہے۔ انہوں نے مغربی شاعری کے علاوہ عربی قدماء سے بھی استفادہ کیا ہے۔ مغرب اور عرب کے ادب کے اثرات کا حسین امترانج، گویا کہ وہ اپنے کلام میں بیک وقت مشرقی بھی ہیں اور مغربی بھی۔

جماعت اپلو:-

جدید دور میں جماعت اپلو کو تقلید پرست تحریک، مدرسہ الدیوان اور رومانوی رجحان کے باہمی اختلاط کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس جماعت کی تشکیل مختلف رجحان و مزاج رکھنے والے شعراء سے ہوئی تھی۔ ابو شادی کے بقول اس کے مقاصد یہ تھے:

”۱..... عربی شاعری کو بلند مقام تک پہنچانا اور شعراء کی کوششوں کو باعزت رخ عطا کرنا۔
۲..... شعر کی دُنیا میں فنی ترقی کی تاسید کرنا۔

۳..... شعراء کے ادبی، معاشرتی اور مادی معیار کو ترقی دینا اور ان کے مقام کی مدافعت کرنا۔“^۱

جماعت اپلو نے شعراء اور ان کی مادی زندگی پر توجہ دینے کے علاوہ اپنے محلے کے ذریعے وسیع پیانے پر ادب کا اہتمام کیا۔ اس جماعت کے دو اہم امتیازات میں ”ذاتی وجودان“ اور ”رمزی تعبیر“ قابل ذکر ہیں۔ اس جماعت کے شعراء کی شاعری کے الفاظ میں عمدگی اور تخلیل میں بالیگی اور افکار میں جاذبیت موجود تھی۔ ان کی شاعری عجمی الفاظ اور غیر عروضی اوزان سے پُر تھی۔

انہوں نے بے قید شاعری کے طرز کو اختیار کیا ہوا تھا۔ انہوں نے شعری نثر بھی لکھی اور موشحات کے انداز پر بھی شاعری کی۔ اس جماعت نے مغربی ادباء کے ادبی میلان و رجحانات کو نوجوانوں

^۱ ڈاکٹر فراں احمد، جدید عربی شاعری، (ادارة الجمود الاسلامية، جامعہ سلفیہ، بنارس۔ سن اشاعت مئی ۲۰۰۷ء مطبع سلفیہ آفسیٹ، وارانسی)

کے سامنے پُر لطف تصویر کشی کر کے پیش کیا۔ چنانچہ مصری عربی اسلاف اور مغربی ادبیات کے درمیان وہ حجاب حائل نہ رہا جو کہ موجودہ صدی کی ابتدائیک برقرار تھا۔

جماعت اپلو میں ایک طرف ترقی پسند شعراء نے اپنے شعری نمونوں کو پیش کیا تو دوسری طرف نئی نسل کے شعراء کو بھی اپنے شعری نمونے پیش کرنے کا موقع بخشا۔ اس کے علاوہ انہوں نے خلیل جبران، ایلیا ابو ماضی، نسیب عریضہ اور میناخائیل نعیمہ جیسے مجری شعراء کے بھی شعری نمونے پیش کئے اور یوں مختلف شعری نمونوں اور مغربی ادبیات سے وسیع واقفیت کی وجہ سے بہت سارے شعراء کے یہاں ایک طرح کے اختلاط نے جنم دیا جس سے شاعری مختلف شعری رجحانات کی آماجگاہ بن گئی۔ اس کی بہترین مثال خود جماعت اپلو کے سربراہ احمد ذکری ابو شادی کی شاعری ہے

”اس کی شاعری میں ان کی شخصیت ایسی منتشر نظر آتی ہے کہ وہ کسی قاعدے، قانون یا نظام کی پابند نہیں،“^۱

قومی آرزوؤں کی عکاس شاعری:-

دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد مصر میں سیاسی حالات کے نشیب و فراز اور اتحل پتحل کے درمیان رونما ہونے والے عظیم واقعات نے شاعری کے مضامین کو بڑا عروج بخشا۔ لگ بھگ سمجھی شعراء نے قومی جذبات اور سیاسی خواہشات کو زبان دیتے ہوئے انہیں اپنی شاعری کا جامہ پہنا یا۔ مصر کے شعراء قوم اور جماعت کا حصہ بن کر ان کی آواز اور ان کے ترجمان بن گئے۔ شاعری کی اس نوعیت کا دائرہ تب اور بھی وسیع ہو گیا جب زندگی کے ہر

۱۔ ڈاکٹر شوتی ضیف، جدید عربی ادب، مترجم ڈاکٹر شمس کمال انجم (الكتاب انترنشنل جامعہ غریبی دہلی ۲۰۰۲)۔ پہلا ایڈیشن سال اشاعت جنوری ۲۰۰۵ء، ص۔ ۱۰۸۔

شعبے میں عوام اور شعراءً ایک زبان بن گئے۔ اس قسم کی شاعری کو ”اجتمائی رجحان کی شاعری“، کے نام سے موسوم کرنا مناسب رہے گا۔ یہ ایک نئے طرز کی شاعری تھی جو لوگوں کی ذات اور جذبات سے قریب تر تھی۔ کیونکہ قوم کی زندگی کے ساتھ اس کا براہ راست تعلق تھا۔ اُن کی زندگی میں پیش آنے والے تمام واقعات اور آرزوؤں کو اپنا موضوع بناتی تھی۔ اس لئے شعراءً کی بھاری تعداد اس سمت روایتی تاکہ وہ بھی قومی اتحاد کے مظاہرے کا شرف حاصل کر سکے اور قومی جذبات کو اپنی شاعری میں ڈھال سکے۔

معاصر شاعری کی جدّتیں:-

معاصر شاعری کی جدّتوں کا جائزہ لینے پر دو طرح کی شاعری کی فلسفیں سامنے آتی ہیں۔ ایک وہ جو کلاسیکی شاعری میں پیدا ہونے والے اوزان و قوانی کے تنوعات یعنی مزدونج، موشع اور رباعی جیسے شعری اصناف پر انحصار کرتی ہے اور دوسری وہ جو مغربی شاعری کی مختلف شکلوں جیسے کہ شعر مرسل (Blank Verse) یا معرّف انظم اور آزاد شاعری (Free Verse) اور قافیے کی مختلف جدّتوں پر انحصار کرتی ہے۔

موجودہ صدی کی ابتداء سے معاصر عربی شعراءً نے قافیے کی قید سے آزاد ہونا شروع کیا اور شعر مزدونج اور شعر مرسل (نظم معرّف) کی طرف ان کا رجحان بڑھنے لگا۔ توفیق بکری، عبدالرحمان شکری، جمیل صدقی اور احمد ذکی ابو شادی وغیرہ نے اس صنف کو برتنے اور تحریک کرنے کی دعوت دی۔ لیکن چونکہ یہ عربی شاعری کے ذوق سے میل نہیں کھاتی تھی اور ساتھ ہی ساتھ اس میں وہ صوتی خاصیت ختم ہو چکی تھی جسے عربوں نے اپنی شاعری میں ابتداء سے ہی جانا اور پہچانا تھا لہذا اس تحریک کو کامیابی نصیب نہ ہوئی۔

اس کے علاوہ عربی شعراء نے آزاد شاعری میں بھی طبع آزمائی شروع کی۔ اس قسم کی شاعری جس میں قافیہ ہی نہیں بلکہ کبھی کبھی عروض و بحور کے بارگراں سے بھی آزادی میسر ہوئی، بلکہ ایسا بھی ہوا کہ مختلف اوزان کے ارکان سے بھی آزاد شاعری کی تخلیق کی گئی۔ مجری شعراء خصوصاً ابو شادی نے اس رجحان میں طبع آزمائی کی۔ اس دلیل کے ساتھ کہ آزاد شاعری میں بھرتی کے الفاظ، تکرار اور قافیے کی مماثلت نہیں ہوتی۔

شوقي کے منظوم ڈرامے:-

احمد شوقي کے دور تک عربی شاعری میں منظوم ڈرامے کا وجود تک نہیں تھا۔ احمد شوقي نے اپنے فرانس کے قیام کے دوران اس جدید مغربی فن پر طبع آزمائی کی اور اسے عربی شاعری میں داخل کر دیا۔

شوقي ضيف کے مطابق:-

”شوقي کا اس مغربی فن میں شاعری کرنا ایک نئی فتح اور عظیم الشان کارنامہ تھا۔

اس لئے نہیں کہ اس نے عربی زبان کو اس فن سے پہلی بار روشناس کرایا بلکہ اس لئے بھی کہ اس کے ذریعے اس نے عامیانہ بولی کے خلاف مقاومت کی۔ جس کا چلن مصری ڈراموں میں عام ہو چکا تھا اور جس سے نوجوانوں کا طبقہ مرعوب تھا۔ کیونکہ اس کے ذریعے عوام کے ملکی و سیاسی جذبات کی ترجمانی ہو رہی تھی۔^۱

تمام اعتراضات کے باوجود بھی شوقي کے منظوم ڈرامے عربی شاعری میں شاہکار ہیں کیونکہ شوقي کو عربی جدید ادبی تاریخ میں پہلی بار اس مغربی فن کو عربی اور مصری فن بنانے میں کامیابی حاصل ہوئی۔ شوقي کے بعد معاصر شعراء میں عزیز اباط نے اس فن کو آگے بڑھایا لیکن

^۱ ڈاکٹر شوقي ضيف، جدید عربی ادب، مترجم شمسِ کمال انجمن (الكتاب انٹرنیشنل جامعہ مکرنی دہلی ۱۹۰۲)۔ پہلا ایڈیشن سال اشاعت جنوری ۲۰۰۵ء، ص۔ ۱۱۶

شوقی اس صنف کا امام ہے۔ کیونکہ نہ صرف اُس نے اس نئی طرز کی شاعری کی بُنیاد رکھی بلکہ اسے عربی شاعری کا مزاج بھی عطا کیا۔
جدید شعر اپرال زامات:-

یہ بجا ہے کہ دورِ جدید کے شعراء نے عربی شاعری کو معانی و بدیع اور صنائع وبدائع کی بھول بھلیوں سے نکال کر کھلی فضا میں پہنچا دیا اور یہ بھی تسلیم کہ عوامی رجحانات کی پیش کشی کی بدولت عربی شاعری ہم عصر زندگی سے قریب تر آگئی لیکن دوسری طرف ان جدید شعراء پر کچھ ازالات بھی عاید ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ عوام کو پیش نظر رکھنے کی وجہ سے ان کی شاعری عہد عباسی کے معیار سے نیچے اُتر آئی اور اس کافی ارتقا رُک گیا۔ دوسرے یہ کہ عوام کی طرف حد سے زیادہ توجہ کی وجہ سے آہستہ آہستہ خود شاعر کی اپنی شخصیت درمیان سے غائب ہو گئی۔ کیونکہ اس کے لئے ضروری ہو گیا کہ ہر حادثے یا واقعے پر کوئی نظم ضرور لکھے اور پھر اپنے واقعی تاثرات کے بجائے ایسے تاثرات پیش کرے جو عوام میں زیادہ سے زیادہ مقبولیت حاصل کر سکیں۔ اسی طرح ہیئت میں قدامت پسندی نے اگر ایک طرف عربی شاعری کی بُنیادی قدروں کی بازیافت اور بحالی میں مدد دی تو دوسری طرف ہیئت کے نئے تجربات کی راہ میں رُکاؤٹ بھی بنی۔ ان خامیوں کو آنے والی نسل نے محسوس کیا اور یہیں سے عربی شاعری نے ایک نیا موڑ لیا۔

دورِ جدید کی مصری عربی شاعری محض اپنے زمانے کی وجہ سے ہی جدید نہیں ہے بلکہ اس میں ہیئت اور مواد دونوں اعتبار سے اتنا غیر معمولی تغیر واقع ہوا ہے کہ یہ اپنی پیش رو شاعری سے دوسرے لفظوں میں عربی شاعری کی تیرہ سو سالہ روایت سے بالکل الگ اور مختلف دکھائی دیتی ہے۔ دورِ جدید کے مصری عربی شعراء نے صرف عربی شاعری کو موسیقیت اور غناہیت سے معمور

کر دیا بلکہ اس میں رنگارنگ تجدیدات، موضوعات و خیالات اور افکار و معانی کی قوس و قزح شامل کر کے اسے دُنیا کی مختلف شاعری سے ممتاز بنادیا۔

دُورِ اقبال

بر صغیر میں اُردو شاعری کے موضوعات، مضامین اور اسالیب

اگر اُردو شاعری کے سفر کی داستان چھپی جائے تو شروعات اُس دور سے کی جاسکتی ہے جب اُردو زبان نے اپنی ایک مستقل حیثیت قائم کر لی تھی اور اس میں اس قدر وسعت پیدا ہو گئی تھی کہ اس زبان کی شاعری کو ہم پراکرت سے علیحدہ یعنی خالص اُردو کی شاعری کہہ سکتے تھے۔

اس سلسلے میں ہم عہدِ شہاب الدین غوری کے شاعر چند گوئی جس کے دو ہے عربی و فارسی کے الفاظ کی بندشوں سے چُست تھے، عہدِ خلجی و تغلق کے مشہور شاعر خسرو جس کی فارسی اور پراکرت الفاظ سے بُنی ہوئی پہلیاں مشہور تھیں، عہدِ سکندر لودھی کے کبیر داس، عہدِ شیر شاہ سوری و اکبر کے تلسی داس، سور داس اور ملک محمد جائسی، عہدِ جہانگیر کے سلطان محمد قلی، سلطان محمد قطب شاہ، خاگی، نوری اور غواسی کو قطعی نظر انداز کرتے ہوئے عہدِ محمد شاہ کے دوران ۱۷۲۲ء میں اپنے دلی کے دوسرے سفر پر آنے والے ولی دُکنی کا ذکر کرتے ہیں۔

”وہ اُردو کے اوپر اسلوب پرست شاعر ہیں۔ جن کی شاعری ان کے

معانی سے زیادہ ان کے اسلوب کی وجہ سے زندہ رہے گی“۔^۱

یہ ولی دُکنی کی شاعری کا تیسرا دور تھا جس میں نہ دُکنی زبان کا لچر پن موجود تھا اور نہ فارسی تراکیب کا ثقل بلکہ وہ ایک شاسترستہ اور شستہ زبان کی شاعری تھی۔ معاملات حکیمانہ گہرائی

^۱ ڈاکٹر سید عبداللہ ولی سے اقبال تک، (بک کار پریشن، دہلی۔ سن اشاعت ۱۹۷۰ء)، ص ۲۸

اور دردمندی و سوز و گداز کی کمی کے باوجود ادن کا کلام بڑا خوش رنگ اور خوشگوار ہے۔
بھار آفرین الفاظ خوش صورت تراکیب، گل و گلگشت کی تکرار، حسن کے ترانے اور نغمے
مناسب بحروف کا استعمال، اسالیب فارسی سے گہری واقفیت اور ان سے استفادہ، ان سب
باتوں نے ولی کو ایک بڑا نگین شاعر بنادیا۔

شمالی ہند میں دورِ اول کے خاص شعراء خان آرزو، آبرو، حاتم، شاگرناجی، مضمون، بیان، امید،
خلاص، وغیرہ ہیں۔ ان شعراء کے یہاں بہت حد تک اردو شاعری کا فطری اور اصلی رنگ ہے۔ تخيیل
شعر میں ایک دلکش سادگی ہے۔ اس دور میں صنعتِ ایہام کا کثرت سے رواج تھا۔ ایہام گوئی
ایک ایسی صنعت ہے جس میں شاعر ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جن کے اصل معنی تک قاری کا
ذہن مشکل سے پہنچتا ہے۔ اردو شاعری کو ایہام گوئی سے پاک کرنے میں میر، مرزا، مظہر اور یقین
نے اہم خدمات انجام دیں۔ اس بحث کے سلسلے میں فرمان فتح پوری یوں روشنی ڈالتے ہیں:

”اس عہد کے وہ سر برآ اور شعراء جن کے کلام میں تغزل کا صحیح رنگ پایا جاتا

ہے اور جنہوں نے ہندی کے نام انوس و لقیل الفاظ ترک کر کے فارسی ترکیبیں اور دہلی

کے محاورات استعمال کئے، شاہ حاتم، مرزا مظہر اور فغان تھے۔“^۱

دوسرے دور کے ممتاز شعراء سودا، میر، درد، سوز اور میر حسن ہیں۔ اس دور شعر و سخن کو اردو
شاعری کا ”عہدِ زریں“ کہا گیا۔ اس دور میں اردو شاعری کا دامن بہت وسیع ہو گیا۔ الفاظ میں
اضافہ ہونے کے ساتھ ہی اردو زبان میں وسعت پیدا ہو گئی۔ درد کی شاعری میں گہرائی پائی جاتی
ہے۔ سوز کے یہاں فطری اظہار محبت زیادہ نمایاں ہے۔ ان دونوں کا کلام ایہام سے پاک ہے۔

^۱ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اردو شاعری کافی ارتقاء، مضمون، ”اردو غزل، ولی سے عصر حاضر تک“، نیاز فتح پوری (ایجو کیشنل پبلی شنگ ہاؤس، دہلی۔ سن اشاعت ۲۰۰۲ء)، ص۔ ۷۷۔

غزل کا معیار جو میر نے قائم کیا وہ انہیں کے لئے مخصوص تھا۔ انہوں نے سوز و گداز، والہانہ ربو دگی، معاملہ بندی، تجزیہ کیفیات، سلاست و روائی، آمد بے ساختہ پن کی جو مثالیں پیش کی ہیں اُن کا جواب کہیں اور انہیں ملتا۔ انہوں نے اُردو غزل کو جاوداں کیف واژدیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے غزل کو ایہام گوئی اور لفظی گور کھو دھندوں سے نجات دلائکر اثر آفرینی کی راہِ دکھانی۔

بر صغیر کی اُردو شاعری کے ہر دور میں غزل یکساں طور پر محبوب و مقبول رہی ہے۔ اگرچہ اسے ”نیم و حشی صنفِ سخن“ کہا گیا لیکن اس کی لطافت و نزاکت، اس کی ایمانیت اور اشاریت، اس کی اثر آفرینی اور اس کے اختصار، اس کی بُرستگی اور ڈرامائیت نے مل ملا کر اسے اُردو شاعری کا اعجاز بنادیا ہے۔ اُردو شعر آنے ہر دور میں اس کے ذریعے جہاں دُنیا کی زنگینیوں کا تذکرہ کیا ہے تو وہیں بے شبانی عالم کا رونا بھی رویا ہے۔ حُسن کے ناز دکھلانے ہیں تو عشق کے نیاز بھی بتلانے ہیں۔ اس کے ذریعے نہ صرف رندی اور پارسائی بلکہ فلسفہ اور تصوف بھی سمجھایا گیا۔ الغرض اُردو شاعری کے ہر دور میں شرعاً نے غزل میں ہر طرح کے خیالات و مضامین کو کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

وَلَی سے لے کر میر تک، سودا اور نظیر کو چھوڑ کر غزل گوئی کا روایتی رنگ ایک ہی سارہا، کیونکہ اس میں جذبات کا داخلی رنگ غالب تھا۔ البتہ سودا نے اس میں تنوع پیدا کیا۔ سودا نے اُردو غزل کو داخلیت سے خارجیت کی طرف موڑا۔ اُن کی شاعری صرف غزل تک، ہی محدود نہ رہی بلکہ انہوں نے قصیدہ، قطعہ، رباعی، مثنوی، ترجیع بند، مستزاد اور مخمس بھی کہا۔ سودا فنِ شعروانشا کے زبردست ماہر تھے۔ انہوں نے قصیدہ گوئی کو آسمان پر پہنچایا۔ میر حسن نے مثنوی کی صنف میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اُن کی مثنوی آج بھی اعجازِ بیان کی

داد لے رہی ہے۔ اس عہد میں سب سے الگ طرز کا شاعر نظیر اکبر آبادی تھا۔ حالانکہ یہ میر کا ہم عصر تھا لیکن میر کی طرح وہ کسی مخصوص انجمن یاد بستانِ خیال کا پابند نہ تھا۔ نظیر نے سب سے پہلے طبقہ عوام کو شاعری میں جگہ دے کر واقعیت و جمہوریت کا رنگ پیدا کیا اور غمِ دوران کا مرتبہ غمِ محبت سے بلند کر دیا۔ اس دور کی اہم خاصیت یہ ہی کہ اصلاحِ زبان کا عمل تیزی سے قدم بڑھانے لگا اور فارسی طرز پر اردو شعر گوئی کی بُنیا دیں مضمبوط ہو گئیں۔

تیسرا دور صحیح انشاً اور جرأت کا ہے۔ اول الذکر دونوں کے ساتھ درباری شاعری کا ایک خاص رنگ اُبھر جس سے شاعری کی حقیقی روح کمزور پڑ گئی۔ لفظ و بیان کی آرائشوں پر زیادہ توجہ ہونے لگی۔ تدوینِ زبان کی باقاعدہ کوششیں شروع ہوئیں۔ فارسیت کا غلبہ نمایاں سے نمایاں تر ہو گیا فنِ خوب چہ کا شعریت پکھ کھوپٹھی۔ جرأت کا رنگِ تغزل انشاً سے بدر جہاز یادہ بہتر ہے۔ سادگی بیان میں یہ میر کے قبیع تھے۔ ان کے کلام میں شوختی و بے با کی بلکہ عربی زیادہ پائی جاتی ہے۔

چوتھا دور وہ زمانہ ہے جب اردو شعر گوئی کے دو اسکول، دہستانِ دہلی اور دہستانِ لکھنوتا یم ہو گئے۔ لکھنوتا یم میں ناسخ و آتش کی استادی کا سکھ چلا جبکہ دہلی میں ذوق، مومن اور غالب نے شاعری میں شہرت کی بلندیوں کو چھووا۔ اسی لئے فرمانِ فتح پوری کہتے ہیں کہ:

”اُردو شعر و ادب کا مرکز جب دہلی سے لکھنوتا یم منتقل ہوا تو اودھ کے حکمرانوں نے دہلی کے مغلیہ درباروں کے حریف و مددِ مقابل بننے کے شوق میں، اُردو شاعری اور اُردو شعر ادونوں کی سر پرستی کی“۔^۱

nasخ نے اصلاحِ زبان کے اس عمل کو مکمل کر دیا جس کا آغاز شاہ حاتم نے کیا تھا۔ ناسخ

۱۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اُردو شاعری کافی ارتقا (ایجو پیش نل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی۔ سن اشاعت ۲۰۰۷ء) ص ۸۔

کے یہاں فن ہی فن ہے شعریت واجبی قسم کی ہے۔

البتہ آتش کی غزل گوئی کا معیار بہت بلند ہے۔ اس کے یہاں روحانیت کی چاٹنی ہے۔ تخلیل کی اطاعت ہے جذبے کی نزاکتوں کا مطالعہ ہے، محبت کا درد لذت اور رنگینیاں ہیں۔ آتش کی شاعری میں مرصع سازی ہے۔

دبستان لکھنو میں نشاطیہ عنصر غالب نظر آتا ہے۔ یہاں کا ماحول ریختی گوئی کو بہت راس آیا۔ اس کی زبان دلی سے زیادہ دلکش اور پُر کش ہے۔ یوں لگتا ہے کہ لکھنو کی زبان کا بناؤ سنگھار وہاں کی شاعری میں مکمل طور پر بس گیا ہے۔

مثنوی کی صنف میں دیاشنکر سیم اور نواب مرزا شوق نے بہت شہرت حاصل کی۔ دیاشنکر سیم کی مثنوی ”گلزار نسیم“، وقتِ نظر، زورِ تخلیل اور قدرتِ بیان کا بہت اعلیٰ نمونہ ہے۔ نواب مرزا شوق کی تصنیف ”زہرِ عشق“، توادب کا وہ اعجاز ہے جس پر اردو ہمیشہ نازکرتی رہے گی۔ عام طور پر لکھنو کی شاعری میں ”سخنِ دل“، ”نہیں“، ”آرائشِ سخن“، ہے۔ ظاہری چڑک بھڑک ہے۔ طبیعت کی رنگینی اور بانکپن کی نمائش ہے۔ یہ چیزیں شاعری کے اعلیٰ معیار سے بہت فروتن ہیں۔

لکھنو میں مرثیہ گوئی کو اس انداز سے عروج و فروع حاصل ہوا کہ اردو کو ایک بیش بہا خزانہ مل گیا۔ اگرچہ مرثیے کی روایات بہت پُرانی تھیں اور دکن و دہلی دونوں کے شعراء نے اس کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا تھا لیکن مرثیہ کو غزل و قصیدہ یا مثنوی کے انداز کی ایک نہایت اہم و ممتاز صنفِ سخن بنادیئے کا سہرا پہلے خلائقِ خمیر کے سر ہے لیکن بعد میں یہ صنفِنظم دیر و انیس کے یہاں معراجِ کمال کو پہنچ گئی۔ ان کی بدولت مرثیے کی صنف کو صرف قبول عام میسر نہیں آیا بلکہ فکر و فن کے اعتبار سے انہوں نے اس کا معیار و مرتبہ اتنا بلند کر دیا کہ مرثیہ اردو میں رزمیہ شاعری کا بدل بن گیا۔

اگرچہ دلی کی تباہی کے بعد بہت سے باکمال شعراء کے شعروخن کا مرکز لکھنو ہو گیا تھا لیکن پھر بھی بہادر شاہ ظفر کے آخر عہد میں بعض شعراء دلی میں ایسے پیدا ہوئے کہ جن کا جواب لکھنو پیدا نہ کر سکا اور جنہوں نے اردو شاعری میں اپنے اسلوب اور بیان کے جھنڈے گاڑھ دیئے۔ یہ ذوق غالب اور مومن تھے۔

ذوق فتنی حیثیت سے اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔ پُر گو بھی تھے اور زود گو بھی۔ قصیدہ گوئی میں بڑا کمال حاصل تھا اور اس صنف میں سودا کے بعد ذوق ہی کا نام سامنے آتا ہے۔ انہوں نے نوجوانی میں ہی ایک قصیدہ بادشاہ کی خدمت میں پیش کر کے خاقانی ہند کا خطاب حاصل کیا۔ لیکن تغزل میں مومن و غالب سے فروتر تھے۔ پھر بھی صحیح رنگِ تغزل ان کے یہاں کافی پایا جاتا ہے۔ انہوں نے اردو غزل کو حسن زبان اور لطفِ محاورہ کا ذوق عطا کیا۔

مومن کی شاعری بالکل جنسیاتی شاعری ہے۔ انہیں تصوف و فلسفے سے کوئی لگاؤ نہیں۔ لیکن ان کے اندازِ بیان کا تیکھا پن، معاملاتِ حسن و عشق کی صحیح ترجمانی، لطیف طنز یا انداز، ان تمام خصوصیات کی بنا پر وہ اپنے تمام ہم عصر شعراء سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ اُن کی غزل میں خالص عشق و عاشقی ہے یعنی اُن کی غزل کا دائرہ حسن و عشق تک محدود ہے لیکن اسی محدود دائِرے میں انہوں نے جدتیں پیدا کیں اور معاملاتِ عشق کی جزئیات کو ایسی خوبصورتی اور فنکاری کے ساتھ پیش کیا کہ نہ کہیں پستی کا احساس ہوتا ہے اور نہ یکسانیت کا۔

نازک خیالی اور مضمون آفرینی مومن کے کلام کی اہم خصوصیات ہیں۔ اُن کے کلام میں ایہام اس طرح سے ہے کہ وہ حسن بن جاتا ہے۔

غالب متعدد ذوق کا شاعر تھا اور اپنی ڈنی اُنج کے لحاظ سے اپنا مشل نہ رکھتا تھا۔ اس کی

شاعری ایک ایسا گلستہ ہے جس میں ہر قسم کا پھول نظر آتا ہے اور ہر پھول اپنی جگہ گل سر سید معلوم ہوتا ہے۔ یہ وہ عہد تھا جب غزل گوئی کے نقش میں نئے نئے رنگ بھرے جا رہے تھے اور غالب اس زمانے کا سب سے بڑا نقاش تھا۔ جس نے غزل کے روایتی خدوخال سے ہٹ کر بالکل نئے طریقہ سے مشاطرگری کی اور یہ کہنا غالباً غلط نہ ہو گا کہ جس حد تک شاعری کا تعلق ہے غالب بڑا انقلابی شاعر تھا اور اس نے اسلوبِ شاعری بد لئے کے لئے اظہار بیان کے ایسے نئے نئے زاویے پیدا کئے جن کی تازگی آج بھی بدستور قائم ہے۔

جو ہر قدوسی کے مطابق:

”غالب نے اردو غزل کو فکر و فن دونوں اعتبار سے متاثر کیا اور غزل میں فکری عصر کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ سمویا۔ انہوں نے فنی اعتبار سے بھی اردو غزل کو وسعت بخشی۔ اظہار کے نئے نئے وسیلے تلاش کئے اور زبان میں ایک اجتہادی شان پیدا کی۔ اپنے پیچیدہ اور تہہ در تہہ جذبات کے اظہار کے لئے نئی نئی علمائیں اور جاندار تشبیہات و استعارات تخلیق کر کے غالب نے اردو غزل کو ایک نئی جہت سے آشنا کیا“۔^۱

ان مشہور شعراء کے علاوہ نصیر دہلوی، ظفر، آزر رده، شیفتہ، داغ، امیر مینائی وغیرہ نے بھی غزل کو آگے بڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ داغ اور امیر مینائی نے اردو غزل کو سادہ زبان، ترمی میں ڈوبا ہوا الہجہ اور لطیف جھنکار پیدا کرنے والا آہنگ عطا کیا۔ ان کی مقبولیت ان کے اسی لطیف و شوخ انداز بیان کی وجہ سے ہے جو سادگی و پرکاری کا بہترین نمونہ ہے۔

امیر مینائی کی شاعری ایک پڑھ لکھے شخص کی میکانی کی شاعری تھی جس میں صحت بیان،

۱ ڈاکٹر جو ہر قدوسی، آئینہ اردو، (اشاعت اول: ۱۹۰۴ء۔ ناشر۔ عکبر پبلی کیشنز سرینگر)، ص۔ ۱۲۷

فیض ختنگی اور پر گوئی وغیرہ تمام باتیں پائی جاتی ہیں۔ لیکن غزل ان کے یہاں نہ ہونے کے برابر تھا۔ ان کے متعلق یہ مشہور ہے کہ انہوں نے مئے وینا کے ساتھ اخلاقیات و روحانیات کی مئے سے وینا یعنی غزل کو بریز کر دیا۔ داع نے اپنے دامن خیال کو داغدار کر کے غزل کے ریخ روشن کو بے داع کر دیا۔ داع کے نزدیک زبان کا چٹکارہ ہی شعر کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

حضرت مولانا صحیح معنوں میں اپنے عہد کے رئیس المبتغز لین تھے۔ انہوں نے اپنی تمام حسرتوں کو یکجا کر کے غزل کو ایک نیازماق حُسن و محبت اور ایک دلش و مترنم انداز بیاں دیا۔ انہوں نے کتنی ایسی تراکیب تراشیں جو اردو شاعری میں راجح ہو گئیں۔ وہ شاعری کے نئے رجحانات اور نئے زاویوں کے نقیب بھی ہیں۔

لکھنو کے حکمرانوں اور شعرا کے ہاتھوں ریختی، گیت اور منظوم ڈرامے وغیرہ اصناف کا اضافہ ہوا۔ ان اصناف کے بعض شعراً خاصے ممتاز ہوئے لیکن لکھنو کی شاعرانہ بہار زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکی۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے دہلی اور لکھنو کے حکمرانوں سے حکومت کی باغ دوڑ چھین کر انگریزوں کے ہاتھ میں دیدی۔ شعروادب کی محفلوں کا خاتمہ ہو گیا لیکن انفرادی سطح پر کام ہوتا رہا۔ زمامِ اقتدار کی منتقلی نے اردو شاعری کو مغربی افکار و اصناف سے مستفید ہونے کا موقع دیا۔ محمد حسین آزاد اور حاتی کے ہاتھوں، غزل کے ساتھ ساتھ مغربی طرز کی نظمیں لکھنے کا رواج ہوا۔ نئے نئے موضوعات پر اور نئی نئی ہیئتیں میں نظمیں کہی جانے لگیں۔ چنانچہ انگریزی شاعری کے طرز پر اردو میں بھی غیر یقینی اور آزادانہ نظموں نے خوب فروغ پایا۔ غزل اور پاہند نظمیں بھی ساتھ ساتھ چلتی رہیں۔ گویا مغربی ادب کے اثر سے اردو شاعری میں موضوع کے ساتھ ہیئت کی تبدیلیاں بھی رونما ہوئیں اور مقبول ہوئیں۔

غزل کے روایتی اشارات تو نہیں لیکن معنی اور اسلوب بیان کی حیثیت سے کلاسیکل غزل گوئی سے انحراف کی ابتداء غالب سے ہوئی۔ لیکن غالب کا یہ اقدام ایک طرح کا غیر شعوری اقدام تھا جس کی اہمیت سے وہ خود بھی واقف نہ تھے۔

لیکن حآل نے اس ضمن میں جو کچھ کیا وہ قصد و ارادہ سے متعلق تھا اور یہ قصد و ارادہ ان میں زمانہ کے حالات و رجحانات کے زیر اثر پیدا ہوا۔ حآل کے بعد اس ضرورت و حقیقت کو جن غزل گوشرا نے محسوس کیا، ان میں اقبال و چکبست قابل ذکر ہیں۔

غزل میں اپنی نوعیت کی یہ بالکل پہلی آواز تھی۔ جس کی روح کو نظموں میں بھی منتقل کیا جانے لگا اور غزلوں میں بھی اس کا رواج ہو گیا۔ جس کا پتہ ہم کو صفحی و ثاقب کے کلام سے بھی چلتا ہے اور اس کے بعد جن شعر کے کلام میں کھلم کھلا اس کی جھلک ملتی ہے ان میں احسان داش، روشن صدیقی، حامد اللہ افسر، حفیظ جالندھری، آخر، صوفی تبسم، تاشیروغیرہ نے زیادہ شہرت پائی۔ یہ زمانہ تھا جب غمِ جانان کے مقابلے میں غمِ دوراں کا احساس بھی پیدا ہو چلا تھا۔ لیکن ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا گیا تھا۔ فرمان فتح پوری اس سلسلے میں یوں قمطراز ہیں:

”اقبال کارنگ سخن دلی و لکھنودنوں کی متغرا نہ شاعری سے بالکل علیحدہ تھا
اور ان کا شماران مصلح شعر میں سے ہے جن کی شاعری ماورائے حُسن و عشق، اس فضا سے تعلق رکھتی ہے جہاں شعر نہیں بلکہ محض فکر کو درخور حاصل ہے۔“^۱

جو ش نے غزل گوئی سے ابتداء کر کے اور اسے ترک کر کے نظم نگاری اختیار کی۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی طبیعت میں محبت کا سوز و گدا مفقود تھا۔ اسی لئے انہوں نے نظمیں کہنا شروع کیں۔

^۱ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اردو شاعری کافنی ارتقا، (ایجوکیشنل پیشنگ ہاؤس، دہلی۔ ۶۔ سن اشاعت ۲۰۰۲ء)، ص ۱۲۹۔

لکھنواور دہلی سے تعلق نہ رکھنے والے شعراء میں وحشت، فانی، اصغر اور جگر خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ وحشت نے بڑی کامیابی کے ساتھ غالب کے اسلوب کی نقل کی۔ فانی کے یہاں پوری تابانی لئے ہوئے میر و غالب جلوہ گرتھے۔ اصغر کے یہاں تصوف غالب تھا اور یہ اس قدر دلکش رنگ لئے ہوئے تھا کہ اس کی مثال دوسرے صوفی شعراء میں نہیں ملتی۔ جگر کا فطری رنگ عاشقانہ ہے۔ شادِ عظیم آبادی اپنے رنگِ تغزل کے لحاظ سے میر اور سوز سے زیادہ قریب تھے۔ بیان کی سادگی، نرم لب و لہجہ، سوز و گداز اور واقعیت جو کہ غزل کی جان ہے شاد کے یہاں دلکش انداز میں موجود ہے۔ یاس (یگانہ) کی شاعری کی گرانما نیگی کا اعتراف تمام نقاد کرتے ہیں۔ اکبر الہ آبادی نے طنز و ظرافت کے سدابہار اور زنگار نگ پھولوں سے کشتِ غزل کو زعفران زار بنادیا۔ اکبر نے جب تک ظرافت اختیار نہیں کی تھی، تب تک اُن کی شاعری قدیم کلاسیکی انداز کی تھی۔ جس میں جذباتیت کا عنصر زیادہ نمایاں تھا۔ فراق اپنی شاعری خصوصاً غزل کے لئے ہمیشہ نیاشعور نیا آسمان اور نئی زمین ڈھونڈنے کے فرقاں میں نظر آتے ہیں۔

جنگِ عظیم کے بعد برصغیر میں آزادی کے جذبات زیادہ ابھرے اور اقتصادی اور معاشی مسائل نے زیادہ اہمیت اختیار کی تو شاعری کا دورِ جدید شروع ہو گیا جسے ترقی پسند تحریک کا نام دیا گیا۔ اردو شاعری میں حقیقت پسندی پر زور دیا جانے لگا۔ اس دور میں بعض حضرات نے کلاسیکی شاعری کو مردود قرار دیا اور اسے بے وقت کی راگنی کہا۔ انہوں نے غزل کے اسلوب وہیئت کو بدل کر مغربی ادب کے اتباع میں نظمیں کہنا شروع کر دیں۔ لیکن ان میں سے بعض ایسے بھی تھے جنہوں نے اسی کلاسیکل پس منظر پر تازہ نقوش پیدا کئے۔ انہوں نے غزل کی بے پناہ اشاریت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی معنویت میں اضافہ کیا اور اس کو ایک نئی جہت

سے آشنا کیا۔ ان ترقی پسند شعراء میں فیض احمد فیض، مجاز، جذبی، فراق، سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، ملا حفیظ ہوشیار پوری، غلام ربانی تاباں، ناصر کاظمی، بشیر بدر، احمد ندیم قاسمی، احمد فراز، مجروح سلطان پوری، خلیل الرحمن عظمی وغیرہ قبل ذکر ہیں۔

بر صغیر کی اردو شاعری ماضی کی شاندار روایات، حال کے میلانات و رجحانات اور مستقبل کی تمناؤں کا بڑا، ہی دلکش امتزاج ہے۔ یہ شاعری تب سے لے کر اب تک ہر دور میں جدیدیت کے مختلف پہلو اجاگر کرتی رہی ہے اور آئندہ بھی یہی امید کی جاسکتی ہے کہ اردو شاعری مع سبھی اصناف اور اُن کے اندر سموجئے ہوئے موضوعات، مضامین اور اسالیب سمیت، ہر زمانہ کے مزاج، مذاق اور انسانی ذہن و شعور کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اپنے اندر خوشنگوار تبدیلیاں پیدا کرتی ہوئی برابر ترقی کی راہ پر گامزن رہے گی۔



تیسرا باب☆

م الموضوعاتِ شعری

(حافظ ابراہیم اور علامہ اقبال)

علامہ اقبال

حافظ ابراہیم

- ہ..... علامہ اقبال کی شاعری کے ادوار تعارف
- ہ..... اقبال کے شعری اصناف حافظ ابراہیم کے موضوعات شعری
- ہ..... اقبال کی غزل گوئی حافظ ابراہیم کی شاعری پر اثر ڈالنے
- ہ..... اقبال کی غزل کی خوبیاں والی عظیم شخصیات
- ہ..... اقبال کی نظم گوئی اور فنی اعتبار سے اُن کی حافظ ابراہیم کی شاعری کے ادوار
- ہ..... نظم کی خوبیاں حافظ ابراہیم کی شاعری پر ایک طائیرانہ نظر
- ہ..... مناظر قدرت حافظ ابراہیم بحیثیت قومی شاعری
- ہ..... قومی اور وطنی نظمیں حافظ ابراہیم کی شاعری میں عناصر و رجحانات
- ہ..... قطعات یا رباعیات حافظ ابراہیم پر تنقید
- ہ..... مشتوی
- ہ..... مرثیہ زگاری
- ہ..... ظریفانہ شاعری
- ہ..... کلام اقبال کی ادبی خوبیاں / اسالیب شاعری

حافظ ابراہیم: تعارف

حافظ ابراہیم جدید عربی ادب کے پانچ اساطین میں شمار کئے جاتے ہیں۔ وہ ایک ایسے شاعر ہو گز رے ہیں جنہوں نے جدید عربی شاعری کی تحریک میں نئی جان ڈال دی۔ انہوں نے دل کی گہرائیوں سے بارودی کے شعری ارتقا کی تحریک کو سمجھ کر، اسے اپنے اسلوب میں اپنا کر، اس کی آبیاری کی۔ اسی لئے انہیں اپنے ہم عصر شعرا کی طرح ”حافظین“ کا لقب عطا کیا گیا۔ حافظین کا ہر گز یہ مطلب نہیں کہ یہ شعراً بشمول حافظ ابراہیم پڑا نے شعراً کے نقال تھے بلکہ اس کے برعکس اُن کے خیالات و موضوعات نئے زمانے سے میل کھاتے تھے اور اپنی ذات و سماج کے مکمل ترجمان تھے۔ یہ شعراً حافظین کھلانے کے حقدار صرف اس صورت میں تھے کہ انہوں نے قدیم عربی شعراً خصوصاً بارودی کے مضامین اور اسالیب کو اپنا کر اس کا تحفظ کیا۔

حافظ ابراہیم کی شاعری کی روح اور موضوعات کو اگر جانچا اور پرکھا جائے تو اس میں یا تو اُس کے ماضی کی تلخ و شیریں یادوں کی صدائے بازگشت سُنائی دے گی یا پھر حال کی آراء و افکار کا اجتماعی احساس ہوگا۔ حافظ ابراہیم کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ وہ جب بھی کبھی کبھی شعر کہنے کا ارادہ کرتے تو پہلے لوگوں کو پیش آیہ مسائل و مشکلات پر اپنی ذہنی توجہ مرکوز کرتے، پھر دل ہی دل میں ان پر غور و فکر کر کے ان کا حل ڈھونڈنے کی کوشش کرتے اور جب مداول جاتا تو اس پورے عمل کو شاعری کا دیدہ زیب جامہ پہنا کر اسے بہترین اسلوب میں ڈھال دیتے۔ عموماً یہی ہوتا کہ اُن کے دور کا عام آدمی جب اس شاعری کی کسی بھی صنف کو سُنتا تو اس کا مضمون، اپنی روح کی تمام اطافتوں اور روانی کے ساتھ اُس کے دل و دماغ میں اُتر جاتا۔ یوں ہر سامع اور قاری ان

اشعار میں اپنی کہانی کھو جنے لگتا۔ اسے اپنے جذبات کی ترجمانی سمجھتا مگر اس پر حافظ ابراہیم کی چھاپ اور مہر ثبت پاتا۔

حافظ ابراہیم عربی شاعری کی مضمون بندی اور حُسنِ اسلوب کے لحاظ سے امتیازی خوبی اور خداداد صلاحیت کا مالک ہے۔ اُس کی فنکاری نے قصیدہ، مرثیہ، نظم اور دوسرے عربی اصنافِ سخن کی بلاغت میں نئی روح پھونکی۔ قلبی واردات کی سچی تعبیر کرنے، قوم کی آرزوؤں، امنگوں اور تمناؤں کی پوری پوری تفسیر کرنے اور اپنے دور کے سماج میں پنتے ہوئے ناسور کی صحیح عکاسی کرنے میں حافظ ابراہیم منفرد حیثیت رکھتا ہے۔

حافظ ابراہیم نے اپنے کلام میں ہمیشہ اپنی تہذیب اور اپنے سماج کی بھرپور ترجمانی کی۔ انہوں نے قدیم اور نئے اسلوب کی آمیزش، اپنے عہد کے مزاج اور اپنی تہذیب و ثقافت کے درمیان اس قدر تعلق پیدا کیا کہ سب کو ایک خوبصورت لڑی میں پروکر کھدیا۔ انہوں نے اپنی طرز میں وہ کمال حاصل کر لیا کہ آنے والے شعراء کو ان کے نقشِ قدم پر چلنابا عیث فخر محسوس ہونے لگا۔

حافظ ابراہیم کی انگریزی ادب سے کم واقفیت کے سبب انہوں نے مصر میں بیٹھ کر یونان کے قصہ نہیں لکھے بلکہ اپنی قوم کے عام آدمی کے مزاج کو پرکھ کر اس کی ترجمانی کی۔ اس معاملے میں ان کی غربت زده زندگی بھی ان کے لئے خوش بخت ثابت ہوئی کہ وہ عوام کے نیچے میں رہ کر ان کی رگ رگ میں سرایت کر گیا۔ عوام دوستی کے معاملے میں حافظ ابراہیم کا کوئی ثانی نہ تھا۔ یہاں تک کہ شوقی اور مطران بھی اس کے آگے کمزور حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی شاعری قدیم دور کی شاعری کی طرح سرمایہ دارانہ ماحول کے شکنجے سے آزاد ہو کر جمہوری اور عوامی احساسات کے لمس سے سرشار تھی۔ اُس کی زبان عام آدمی کی روزمرہ بول چال تھی جو کہ عام سطح کے لوگوں کے لئے آسانی سے قابل فہم

تھی۔ وہ اپنے بیان میں بے تکلف اور واضح تھا۔ وہ اپنے دور کا ایک گنگنا تا ہوا صحافی تھا۔

بقول شوقي ضيف:

”وہ مصری قوم کا ایسا آئینہ ہے جس میں اس کی ذات و خواہشات اور مصری سماج میں برپا ہونے والے دینی، سیاسی اور معاشرتی اصلاح کا احساس و شعور شوقی سے روایا جاتا ہے۔“^۱

حافظ ابراہیم عوام کا ماہر نباض تھا۔ اُس نے اپنی ذات، اپنے رنج و محن سے پُر زندگی اور اپنے مکمل مصری مزاج کو اپنی شاعری میں ایسے حلول کیا کہ اپنی ذات کی ترجمانی کے علاوہ عوام کی ترجمانی کی حق ادایگی کا بھی فریضہ انجام دیا۔

انہوں نے بڑی سچائی و بے باکی کے ساتھ مصری عوام کی روزمرہ زندگی، وہاں کی سیاسی بساط پر ہورہی اتھل پتھل، سماج میں ہورہی تبدیلیاں، دینی سوچ اور فکر سے متعلق لوگوں کی سرگرمیاں، غرض ہر رونما ہونے والے واقعے کی بڑے لطیف انداز میں عکاسی کی ہے۔ اُن کے دیوان کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اُن کے موضوعات رنگارنگ ہیں۔ انہوں نے اپنے مدحیہ قصائد اور مرثیوں میں شیخ محمد عبدہ کی اصلاحی دعوت کا ذکر کیا ہے، خلافت عثمانیہ اور روس و بلقان کے درمیان جنگ و جدل کی خوب صورت منظر نگاری کی ہے۔ حضرت عمر کی سیاست، تدبر اور فتوحات کے بارے میں فخریہ انداز میں تذکرہ کیا ہے، عربی زبان اور اس کی ماضی کی عظمت کی داستان سناتے ہوئے اس کی موجودہ صورت حال پر کف افسوس ملا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ روس پر جاپان کی فتح پر بھی خوشی کا اظہار کیا ہے اور اسے مشرق کی مغرب پر فتح قرار دیا ہے۔ حافظ ابراہیم

^۱ ڈاکٹر شوقي ضيف، جدید عربی ادب، ترجمہ ڈاکٹر شمس کمال الجم، (سال اشاعت: جنوری ۲۰۰۵ء)، ص۔ ۸۹

کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اگر اس کی شاعری کو ترتیب سے پڑھا جائے تو مصر کی تاریخ بن جاتی ہے۔ اُن کی شاعری اُن کے دور کا آئینہ ہے جس کے صاف و شفاف سینے پر مصر کی بولتی تصویریں رقص کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ اُن کی شاعری میں مصر کی سر زمین کے تین والہانہ عقیدت کے جذبات ہیں۔ مصر کی عظمتِ رفتہ کے تذکرے ہیں، حالات و واقعات کا بغور مشاہدہ اور بے کم و کاست بیان ہے، اس کے علاوہ مصر کے جانشوروں کا ذکر ہے اور حافظ ابراہیم نے کمال ہنر مندی سے حسین اور پُر اطف، چاشنی بھرے الفاظ میں ان سبھی معاملات کا یوں نقشہ کھینچا ہے کہ دل سے تحسین و آفرین کے کلمات نکلتے ہیں۔

حافظ ابراہیم کی شاعری خالص اخباری شاعری ہی نہیں ہے کہ جس میں وہ روزمرہ کے واقعات کو خوبصورت الفاظ کا جامہ پہناتا ہے بلکہ اُس کی نظر مختلف سماجی اور سیاسی مسائل پر بھی ہے جو کہ عوام سے کسی نہ کسی طور جوڑے ہوئے ہیں جیسے مہنگائی، نہر سویز کا مسئلہ، ستور، عربی زبان، عورتوں کی تعلیم، معاشری بدخلی، انقلاب، اپنی حکومت آپ وغیرہ جن پروہ ایک ثابت طرزِ فکر اپناتا ہے۔

بقول عباس محمود العقاد:

” فهو شاعر الحياة القومية في كلامه عن اللغة الفصحى وعن السفور و الحجاب وعن مضاربات الأغنياء في سوق القطن“.^۱

(ترجمہ:- وہ اپنے کلام میں قومی زندگی کا شاعر ہے، ان کا کلام فصحیح عربی زبان، بے پردوگی اور حجاب کے متعلق ہے۔ اسی طرح کاٹن مارکیٹ میں مالداروں کی تجارت کے متعلق ہے۔)

حافظ ابراہیم کے دیوان کے بیشتر اور اراق مصر اور عرب کے سیاسی، سماجی، تہذیبی، اقتصادی اور معاشرتی معاملات کی عکاسی سے آ راستہ ہیں۔ اُن کی حساس طبیعت کا یہ خاصہ تھا کہ اپنے اردوگرد

^۱ ڈاکٹر فوزان احمد، جدید عربی شاعری، (ادارة البحوث الاسلامية، جامعہ سلفیہ، بناres، سن اشاعت میں ۲۰۰۴ء مطبع سلفیہ آفسیٹ، وارانسی)، ص۔ ۳۶۵

ہورہی ہر قسم کی سیاسی و سماجی تبدیلی پر ان کا فلم جنگش میں آنے لگتا اور وہ اس کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے اور اشعار کا خوبصورت پیرا ہن عطا کر کے مسائل کا تدارک کرنے کی کوشش کرتے۔ طبیعتاً قوم پرست، خوش اخلاق، مزاجاً فطرت پسند، غمِ دوراں اور غمِ روزگار کے شکار اپنی تیئی اور قوم کی زبوں حالی کا احساس دل میں لئے اور حد درجہ منکسر المزاج حافظ ابراہیم کی ادبی شخصیت کا مطالعہ کرنے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اس کی تشكیل و تعمیر میں بہت سارے عناصر نے حصہ لیا۔ پہلا اور سب سے اہم عنصر حافظ ابراہیم کی ”مصریت“ ہے یعنی اس کی رگوں میں دوڑنے والا اور اشیٰ خون خالص مصری تھا۔ مصریت اس کے رنگ، مزانج اور روح میں سراحت کر گئی تھی۔ دوسرا عنصر حافظ ابراہیم کی ”عربیت“ ہے جو کہ اُسے قدیم ادب کے مطالعے سے حاصل ہوا۔ محمود السامی بارودی کی شاعری اُس کی شاعری کی اساس تھی اور خود بارودی اُس کا مرکز نگاہ تھا۔ اُس کی شاعری سے اُس کا شعوری اور روحانی رشتہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے خالص عربی اسلوب کو اپناتے ہوئے بارودی کے شعری آہنگ، زور بیاں اور فصاحت و بلاغت کو نہ صرف زندہ کیا بلکہ اس میں مزید وسعت دے کر اسے ممتاز کر دیا۔

حافظ ابراہیم کی شخصیت کی تشكیل میں مصر کے ”سماجی ماحول“ کا عنصر بھی شامل تھا۔ متوسط طبقے میں اُس کی نشوونما اور اعلیٰ طبقے سے میل جوں نے اُسے عوام و خواص میں یکساں محبوب و مقبول بنالیا تھا۔ اس کے علاوہ ”مزہبی“ اور ”وطن پرستی“ کے عناصر نے بھی حافظ ابراہیم کی ادبی شخصیت کی تعمیر و تشكیل میں اپنا حصہ ادا کیا۔ اس کے علاوہ ان کی شخصیت فقرو فاقہ، محتاجی، رقیق القلبی، غایت درجہ کی لطافت، نرمی، سچائی، خدمتِ خلق سے معمور، حوادث زمانہ کی تلخیوں کا شکار اور زندہ دلی کا مرکب تھی۔

حافظ ابراہیم کے موضوعات شعری:-

حافظ ابراہیم کی شاعری کے موضوعات ان کی زندگی کی طرح متنوع اور زنگارنگ ہیں۔

ان کے دیوان پر طائرانہ نظر ڈالنے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ انہوں نے مدحیہ قصائد کے ساتھ ساتھ بے شمار نظمیں ایسی بھی لکھی ہیں کہ جن میں سیاسی، اجتماعی، معاشرتی، تاریخی اور سماجی احوال و واقعات کو پُر اثر اسلوب میں پیش کیا گیا ہے۔ ان قصاید اور نظموں کے ذریعے حافظ ابراہیم نے اپنے قوم کے مُردہ عروق میں روح پھونکنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ انہوں نے ایک دیدہ ور کی حیثیت سے اپنے وطن کے لوگوں کو ہر قسم کے خطرات اور مشکلات سے آگاہ کرنے کا فریضہ انجام دیا ہے جو کہ قوم کی ناچاکی اور ناتفاقی کی بنا پر پیدا ہو گئے تھے اور ان کی ہلاکت و تباہی کا سبب بن سکتے تھے۔ اس کے علاوہ حافظ ابراہیم نے اپنے دور کے برگزیدہ اور عظیم شخصیات کے مرثیے بھی لکھے ہیں۔ یہ مرثیے ان عظیم اشخاص کے صرف ذاتی اوصاف و مکالات ہی بیان نہیں کرتے بلکہ ان کے ذریعے حافظ ابراہیم نے ان تاریخی عوامل کی نشاندہی بھی کر دی ہے جنہوں نے ان شخصیات کو نمایاں اور ممتاز کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ حافظ ابراہیم کے مرثیے اپنے واقعات کو صحیح تناظر میں دکھانے اور مستند اشخاص کو بنا کسی غلو کے پیش کرنے کے اہل ثابت ہو کر مصری تاریخ کا ایک اہم حصہ قرار دیئے جاسکتے ہیں اور یہ دلیل دعوے کے ساتھ پیش کی جاسکتی ہے کہ حافظ ابراہیم کی شاعری کے مطالعہ کے بغیر جدید مصر کی قومی، مذہبی، سیاسی اور ادبی تاریخ ادھوری رہے گی۔ ان کے قصائد میں ان کی ذاتی زندگی کے مسائل و مشکلات کے ساتھ ساتھ قومی اور طبقی واقعات کی جھلک نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ ان کی زندگی ان کی شاعری اور ان کی شاعری، عام زندگی کا آئینہ ہے۔ انہوں نے اپنی شاعرانہ قدرتِ کلام سے لوگوں کو

حالات اور اُس کی ستم ظریفیوں کے خلاف نبرد آزمائونے کے لئے نہ صرف اُکسایا ہے بلکہ ہمت بھی عطا کی ہے۔ انہوں نے اپنے کلام کو سماج اور ماحول کی صحت مند تبدیلی کے لئے ایک ذریعہ کے طور پر استعمال کیا ہے۔

پچھاں کی شخصیت میں رچا ہوا حزن و یاس اور پچھاں کا زمانے اور روزگار کے تین غم، دونوں نے مل کر حافظ ابراہیم کے قلم سے نکلے ہوئے ہر لفظ کو پُرا اثر اور پُر تاثیر بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مرثیے غم و اندوہ کی اشکبیار داستانیں ہیں جن میں وہ درد کی ٹیسوس سے سسکتے ہوئے زخم دکھاتے ہیں۔ انہیں ہمیشہ اپنا کلیجہ چیر کر دکھانے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتا کیونکہ انہوں نے قوم اور انسانیت کا درد اپنے اندر سمایا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مرثیہ کو انفرادیت سے نکال کر اس میں اجتماعیت کا رنگ بھرنے کا سہرا انہیں کے سر ہے۔ انہوں نے کئی قومی شخصیات کے بارے میں مرثیہ لکھا ہے، جس میں انہوں نے اُن شخصیات کو قوم کے احساسات کے ترجمان کی حیثیت سے پیش کر کے انہی احساسات و جذبات کی بڑے ہی غمزدہ لمحے میں ترجمانی کی ہے۔ ڈاکٹر طاہر حسین کہتے ہیں:

”فَكَانَ شِعْرُ حَافِظٍ أَصْدِقَ صُورَةً لِهَذَا الْجَزْعِ لَا غُلُوْ فِيهَا وَلَا

تَقْصِيرٌ، وَلَا ضَعْفٌ فِيهَا وَلَا وَهْنٌ“۔^۱

(ترجمہ: حافظ کی شاعری اس حالتِ زار کی سچی تصور پیش کرتی ہے۔ نہ اس میں کوئی غلو ہے اور نہ ہی کوئی کوتا ہی، نہ اس میں کوئی ضعف ہے اور نہ ڈھیلاپن)

چونکہ دور حافظ ابراہیم میں صحافت کا بول بالا تھا اور اخبارات زورو شور سے شائع ہو رہے تھے جو کہ سیاست، ثقافت اور سماج کو موضوع بنانے کے ساتھ ساتھ ادب کو بھی اپنے صفحوں کی زینت بنارہے تھے۔ اس لئے حافظ ابراہیم نے اپنی شاعری میں سیاست اور سماج کو موضوع

بناتے ہوئے مصری قوم کی ترجمانی کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ عوام کے جذبات و احساسات اور درد غم کو شاعری کی حسین گنگناتی زبان دینے کی وجہ سے حافظ ابراہیم کا جو رتبہ مصری ادب و سماج میں تھا، وہاں بار و دی اور شوّقی جیسے شعراء کی پہنچ بھی ممکن نہ ہو سکی۔

اُنہوں نے اپنی شاعری کی زبان کو آسان اور واضح بنایا۔ وہ روزمرہ اخبارات میں اپنے اشعار شائع کرواتے۔ جن کا مرکزی خیال، مُدعا اور غرض وغایت اُس وقت کے خطیبوں اور سیاستدانوں سے میل کھاتا تھا۔ حافظ ابراہیم نے صحیح معنوں میں اُس وقت کے مصری سماج کی روح اور بُض کو اچھی طرح پہچان کر اُسے اپنی شاعری کی لطیف غذا سے مسروک کیا۔ اس ضمن میں اُس کے یہ اشعار سندر کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔

وَمَا أَنْتَ يَا مَصْرِ دَارُ الْأَدِيبِ وَلَا أَنْتَ بِالْبَلْدِ الْطَّيِّبِ
أَيْعَجْنِي مِنْكَ يَوْمُ الْوَفَاقِ سَكُوتُ الْجَمَادِ وَلَعْبُ الصَّبَّىٰ^۱

(ترجمہ: اے مصر، تو نہ تو ادیبوں کا مرکز ہے، نہ ہی اچھا ملک۔ کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ معاهدے کے روز جمادات کا سکوت اور بچوں کا کھیل کو دیکھے اچھا گا)

حافظ ابراہیم کی شاعری اگرچہ غم والم کی ترجمان ہے لیکن اس ترجمانی کا خاصہ یہ ہے کہ اس نے انفرادیت کو اجتماعیت میں مغم کر لیا ہے۔ یعنی وہ اور مصری معاشرہ ایک اکائی کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ شاعر اپنے آپ کو ملک و قوم سے الگ نہیں پہچانتا اور اپنی شکستہ اور زبوں حالی کو ملک و قوم کی بدحالی سے تعبیر کرتا ہے، یعنی دونوں کو ایک سمجھتا ہے۔ یہی وہ راز ہے جس نے حافظ ابراہیم کا مقام احمد شوّقی سے بھی بلند کر کے اُسے مصر کا عظیم قومی شاعر بنادیا۔

حافظ ابراہیم وہ واحد عربی شاعر ہے جسے بیک وقت عام اور خواص میں یکساں پذیرائی ملی۔ عوام

¹ ڈاکٹر شوّقی ضیف، جدید عربی ادب، مترجم: ڈاکٹر نشیش مکال انجمن (الكتاب انٹرنشنل جامعہ مگرنتی ولی سال اشاعت جنوری ۲۰۰۵ء)، ص۔ ۱۳۶۔

اُسے اپنے دکھ در کاتر جمان سمجھتے تھے جبکہ خواص اُسے اپنے خیالات و رجحانات کا نقیب مانتے تھے۔
اُن کی شاعری کے اسی پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالطیف حمزہ لکھتے ہیں:

”حافظ ابراہیم کو اگر سماج کا شاعر کہا جائے تو بے جانہ ہوگا۔ اپنے اشعار میں

حافظ ابراہیم سماج کی خرابیوں کی طرف بے انداز احسن اشارہ کرتے تھے اور پھر ان خرابیوں سے

بچنے کی ترغیب دیتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے جا بجا بائیمی ناتفاقی، غیر قوموں کی مداخلت اور

عربی زبان کی ابتری پر اشعار کہے ہیں اور اخلاقی جذبات کو ابھارا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن

کے اشعار میں محض ماضی کا اندھیرا ہی نہیں ہے بلکہ روشن مستقبل کی جھلک بھی ہے۔“

جہاں تک عربی شاعری کی عوامی جذبوں کی ترجمانی، سیاسی، معاشرتی اور دینی رجحان کی طرف رہنمائی کرنے کا سوال ہے تو حافظ ابراہیم صفت اول کے شعر میں شمار کئے جائیں گے۔ وہ شاعری کے اس کارروائی کے لئے ہمیشہ سینہ سپر بنے رہے جس نے اگر ایک طرف قدیم عباسی شاعری کی محافظت کی تو دوسری طرف اسی اسلوب میں جدت طرازی کرتے ہوئے اسے اس مقام پر پہنچایا کہ وہ روز مرہ زندگی کا آئینہ بن گئی۔

حافظ ابراہیم کی شاعری پر اثر ڈالنے والی عظیم شخصیات:-

بعض نقادوں نے حافظ ابراہیم کو عباسی شاعر نختری سے قریب تر قرار دیا ہے۔ ایسا شاید انہوں نے اس لئے کہا ہوگا کیونکہ اُن کے اسلوب، مضامین اور شاعری کی بنیادی قدروں میں یکسانیت پائی جاتی ہے لیکن جن شخصیات نے حافظ ابراہیم کو متاثر کیا اُن میں سے سرفہrst محمود السامی بارودی ہے۔ حافظ ابراہیم نے دل کی گہرائیوں سے بارودی کے شعری

ارتقاء کی تحریک کو سمجھا اور پھر اسے اپنے اسلوب میں اپنا کراس کی آبیاری کی۔ اُس کی شاعری کی اساس بارودی کی شاعری تھی۔ وہی اُس کا آئینہ میں اور مرکز نگاہ تھا۔ اُس کی شاعری سے اُس کا شعوری اور روحانی رشتہ تھا۔ اس کے کلام کا اگر باریکی سے مطالعہ کیا جائے تو اس کی پوری شاعری میں بارودی کے شعری آہنگ، زورِ بیان، فصاحت و بلاغت اور خالص عربی اسلوب کی آمیزش ضرور ملے گی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ شاعری اور میدان جنگ دونوں جگہ پر حافظ ابراہیم کے امام محمود السامی بارودی تھے۔ اس بارے میں ڈاکٹر طلحہ حسین لکھتے ہیں:

”حافظ تلمیڈ صریح للبارودی قلده مُنذ نشا، ثُمَّ تشجعَ فقلَّدَ

المتقدِمین الذين كان يتأثرهم البارودي نفسه“^۱

(ترجمہ: حافظ واضح طور پر بارودی کا شاگرد تھا۔ جب سے وہ شاعری میں پلا برہا اُس نے اس کی پیروی کی پھر اس کی ہمت بڑھی تو متقدِمین کی پیروی کرنے لگا جن کی البارودی خود پیروی کرتا تھا۔)

بارودی کی شخصیت نے حافظ ابراہیم کی زندگی کے اہم پہلوؤں کا رُخِّ متعین کیا۔

سوڈان کی بغاوت سے حافظ ابراہیم کی شاعری کو ایک نیا موڑ اور نیا رُخِّ ملا جیسا کہ ان کے اس شعر سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے:

اذا شئت أن تلقى السعادة بينهم فلاتك مصر يا ولا تك مسلماً^۲

(ترجمہ: اگر آپ ان میں سعادت دیکھنا چاہتے ہیں تو آپ کونہ تو مصری ہونا چاہیے اور نہ ہی مسلمان)

اس بغاوت سے حافظ ابراہیم کو سبکدوٹی کا پروانہ ملا لیکن اس کے بد لے میں اُسے اپنے اُستاد محمد عبدہ اور قومی تحریک کے رہنماؤں جیسے سعد زغلول، مصطفیٰ کامل، احمد لطیفی سید، حسن عاصم، محمود سلطان نیز مطران جیسے ذہین لوگوں سے راہ و رسم بڑھانے کے موقعے ملے جس سے عوام

^۱ ڈاکٹر طلحہ حسین، المجموعۃ الکاملۃ، (جلد دوازدھم)، ص ۳۹۲۔

^۲ نفس المرجع، ص ۳۵۔

میں اُس کی ساکھ بنی اور وہ عوام کا ہر دل عزیز ہونے لگا۔

شیخ محمد عبدہ نے حافظ ابراہیم کو اس بات کے لئے آمادہ اور مہمیز کیا کہ وہ قومی اور ملکی سلط
کے جذبات سے بالاتر ہو کر عالمِ اسلام کے مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنائے اور دنیا بھر
کے مسلمانوں کے دلوں میں اپنی شاعری کے ذریعے یاں اور نا امیدی کی جگہ حوصلہ اور امنگ بھر

دے۔ اس بارے میں رشید احمد ارشد سابق استاد ادبیات عربی کراچی یونیورسٹی رقم طراز ہیں:

”فوجی ملازمت چھوڑ دینے کے بعد ان کا تعلق مصر کے حریت پسند قومی
لیڈروں سے قائم ہو گیا۔ جو جمال الدین افغانی کے تربیت یافتہ تھے۔ اس وجہ سے ان کی
شاعری عوام اور قوم کے لئے وقف ہو گئی۔ انہوں نے قومی تحریکات میں بڑھ چڑھ کر حصہ
لیا اور اپنی شاعری کے ذریعے مصر کے نوجوانوں میں سیاسی، معاشرتی اور علمی بیداری پیدا
کر دی۔ ان کا دیوان مصر کی قومی تحریکات اور اہم واقعات کی منظم تاریخ ہے۔^۱

اس کے علاوہ عبد الحمید سند الجندی کے مطابق:

”وہ مصر کے مشہور قہوہ خانوں نیوبارمشیدی اور متایا جایا کرتا تھا، جہاں وہ شیخ مطربی
ولی الدین لیکن، ابراہیم الدباغ، فواد الصاعقۃ اور خلیل مطران سے ملاقی ہوتا تھا۔ ساتھ ہی وہ ایک
اور قہوہ خانے سبلندر بار جایا کرتا تھا، جہاں وہ ڈاکٹر شبیل شمیل، جورج طنوس، طنوس عبدہ، سلیم
سرکیس اور ڈاکٹر ابراہیم شدوڈی وغیرہ سے ملا کرتا تھا۔ وہ ”بار للواء“ کا رخ بھی کرتا تھا جہاں
داو و برکات ”الاہرام“ کے ایڈیٹر توفیق فرغی اور شامی صحافت سے وابستہ دوسرے لوگ بیٹھا کرتے
تھے۔ ان شخصیات کے ساتھ تبادلہ خیال نے بھی حافظ ابراہیم کے ذہن کو وسعت بخشی۔^۲

۱۔ برهان، (جولائی ۱۹۵۸ء)، ص۔ ۳۔

۲۔ الجندی، حافظ ابراہیم شاعرالنیل، ص۔ ۵۔

حافظ ابراہیم کی شاعری کے ادوار:-

حافظ ابراہیم کی شاعری کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا دور ابتداء سے لے کر سن ۱۹۰۳ء تک کا ہے۔ اس زمانہ میں اُس نے اپنی امیدوں کو مصر میں تخت خدیویہ اور آستانہ میں تخت خلافت سے وابستہ دیکھا تو اس کی زبان سے عباس عبدالحمید کے مدحیہ قصائد رواں ہو گئے۔ بعد ازاں اُس کو انگریزوں سے اچھی امید اور حسنِ ظن پیدا ہو گیا۔ اس لئے اس دور میں وہ انگریزوں کے لئے برملا نفرت اور حقارت کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ بلکہ مصالحانہ رویہ کو ترجیح دیتے تھے اور کسی حد تک خوشامد سے بھی کام لیتے تھے۔ چنانچہ اس دور میں اُس نے ۱۹۰۴ء میں ملکہ وکٹوریہ کی موت پر مرثیہ کہا، ۱۹۰۲ء میں ایڈوارڈ ہفتم کی تاجپوشی کے موقع پر مبارک باد کی نظم اور لارڈ کروم کے لئے الوداعی قصیدہ پیش کیا۔

اُن کی شاعری کا دوسرا دور ۱۹۰۳ء سے ۱۹۱۱ء تک کا ہے۔ اس زمانے میں وہ ملازمت سے نکالے جا چکے تھے اور وہ امام محمد عبدہ اور اُن کی معززین ملک پر مشتمل جماعت سے کافی قربی روابط بنائے چکے تھے۔ چنانچہ وہ یکسوئی سے قوم کی جانب متوجہ ہو گئے، یہاں تک کہ وہ اپنے پر جوش و جواں وطنی جذبات لے کر مصطفیٰ کامل کے جھنڈے تسلی سرگرمِ عمل ہو گئے۔ انہوں نے اپنے شکوئے کو ملک کے شکوئے میں ضم کر دیا اور اپنے دل کے ساز کو جہاد کے نغموں کے ساتھ بجانے لگے۔ انہوں نے اس دور میں حقیقی معنوں میں دل کی گہرائیوں سے جوانی کی آرزوؤں اور اپنی شاعری کے ذریعے عوام کے مافی اضمیر کی ترجمانی کی۔

اس دور میں انہوں نے کھل کر انگریزوں کی مخالفت کی اور ہر قسم کی قومی وطنی اور سیاسی تحریک میں اپنے آپ کو پیش پیش رکھا۔ اس دور کو حقیقی معنوں میں حافظ ابراہیم کی قومی شاعری

کے شباب کا دور کہا جاسکتا ہے۔ اس دور میں انہوں نے بہترین سیاسی و سماجی الغرض عوامی جذبات کی ترجمانی کی نظمیں کہی ہیں۔ بقولِ نسیمہ فارقی :

”حافظ کی قومی شاعری اس مرحلے میں اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ اس عرصے میں وادیٰ نیل میں رونما ہونے والے تمام حادثات و واقعات کی بازگشت ان کی شاعری میں صاف سُنائی دیتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر ہم چاہیں تو اس کی مدد سے اس دور کی ایک سیاسی و سماجی تاریخ بآسانی مرتب کر سکتے ہیں“۔^۱

حافظ ابراہیم کی شاعری کا تیسرا اور آخری دور ۱۹۳۲ء سے شروع ہو کر ۱۹۴۱ء میں ان کی وفات پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ اس دور میں انہوں نے ”دارالکتب المصریہ“ میں سرکاری ملازمت حاصل کر لی۔ جہاں وہ شعر و ادب شعبے کے انچارج کی حیثیت سے تعینات کئے گئے۔ اس دور ان انہوں نے قومی نظمیں بہت کم لکھیں۔ بلکہ شعر گوئی سے انہوں نے ایک طرح سے لاعقلی اختیار کر لی۔ صرف تقریبات وغیرہ کے موقع پر انہوں نے چند نظمیں کہی ہیں۔ نقادوں کا خیال ہے کہ انہوں نے سرکاری ملازمت کی وجہ سے اپنے جذبات و احساسات کے اظہار پر پابندی عاید کر دی اور معاشی ضرورتوں کی خاطر مجبوراً اپنے اندر کے قومی شاعر کا گلا گھونٹ دیا۔

اس دور میں ان کی صرف دونوں نظموں کی شاعری ان کے دوسرے دور کی شاعری سے ہم آہنگ ہے۔ پہلی نظم مصری خواتین کے ایک حکومت مخالف مظاہرے کا سماں پیش کرتی ہے جبکہ دوسری نظم اسماعیل صدقی کے ہاتھوں ظلم و ستم کا حال بیان کرتی ہے۔ ان نظموں کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ ان میں محاکمات اور منظر زگاری بہت ہی دلکش اور شاعرانہ ہے۔ ان میں طنز و تمثیل کا رنگ

^۱ نسیمہ فاروقی، جدید عربی شاعری، (اسلام کتب سینٹر لکھنؤ۔ اشاعت اگست ۱۹۷۷ء)، ص۔ ۸۲۔

چھلکتا ہے اور شاعر نے چھوٹی سی چھوٹی جزئیات کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے جس سے پورا چلتا پھرتا منظر الفاظ میں سما گیا ہے۔

حافظ ابراہیم کی شاعری پر ایک طائرانہ نظر:-

حافظ ابراہیم کی شاعری بیک وقت کئی پہلوؤں کی غماز رہی ہے۔ ایک طرف یہ اپنی قوم کی فلاح و بہبود کی نقیب بن کر اونچے ایوانوں میں بسنے والے حکمران طبقے سے حساب مانگتی ہے تو دوسری طرف اس نے اپنے بحر و قوانی کو مظلوموں کی آہوزاری، دادرسی اور غرباء کی شکم پر سی کے لئے وقف کیا ہے۔ اس پڑھ یہ کہ حافظ ابراہیم نے وطن کی محبت میں سرشار ہو کر ترانے گائے جو اس قدر لوگوں کے دلوں میں سما گئے کہ وہ عوام کے دل کی دھڑکن بن گیا اور ”عوام کا شاعر“ کے طور پر مشہور ہوا۔ کمال نجمی نے اُسے ”ابن البلد“ کا خطاب دیتے ہوئے کہا ہے:

”فقد كانت صورة تلوك هي صورة ”ابن البلد“ الفصيح، اللامعي

الذرب اللسان الحاذق الفهامة العلامة بكل شيء!“^۱

(ترجمہ: ان کی صورت فرزندوطن کی صورت تھی جو انتہائی فصحی زیرک، چسب زبان، فطیں اور ہر چیز کو جاننے والا تھا۔)

عربی ادب میں جہاں تک مصری شاعری کے رتبے کا سوال ہے تو ہمیشہ سے ہی اس میدان میں عراق، حجاز اور اندرس چھائے رہے اور مصر ہمیشہ دوسرے درجے پر فائز رہتے ہوئے اول نمبر کے لئے ترستا رہا۔ لیکن جدید عربی شاعری کے اس روشن دور نے صدیوں کا حزن و ملال دور کر دیا اور مصر کو نہ صرف اول مقام پر سرفراز کر دیا بلکہ اسے ہر طرح سے فوقیت عطا کی۔

اس عظیم الشان مرتبے پر مصر کو فائز کرنے میں جن عظیم شعراء نے اپنے جگہ کا خون جلا جلا

کر بحور واوزان کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر گوہر نایاب ڈھونڈے ہیں۔ اُن میں صفتِ اول میں حافظ ابراہیم دوسرے شعر کے ہمراہ تزک و احتشام سے کھڑے نظر آتے ہیں۔

حافظ ابراہیم کے قصائد حکام وقت کے اعمال کے نگراں ہیں۔ ایک ایسا نگراں جو ظلم و زیادتی کے خلاف صفات آ را ہو جاتا ہے اور ظالم کے سامنے صرف دور استے چھوڑتا ہے اول یہ کہ وہ اپنے کئے پر پشمیاں ہو جائے اور دوم یہ کہ اُسے ظلم کے نتائج سے آ گاہ اور متنبہ کر کے اُسے حق و انصاف کے لئے مجبور کر دے۔ اس ضمن میں حادثہ نشوای کی مثال پیش کی جاسکتی ہے۔ حافظ ابراہیم نے اس حادثے کو شعر کے پیرا ہن میں پیش کرنے کے سلسلے میں سمجھی دیگر مصری شعر اپر سبقت حاصل کی ہے۔ جان اے ہائے ووڈ (John A. Haywood) کے مطابق:

"Hafiz wrote the Dinshiway fifteen days after the sentences had been passed, while Showqi waited a year, then wrote a fourteen verse poem largely concerned with the widows and the imprisoned"^۱

حافظ ابراہیم نے قصیدے میں اس افسوسناک حادثے کی آڑ میں انگریزوں کی تہذیب و ثقافت، دانشمندی و فرزانگی اور علم و آگہی پر بھر پورا نداز میں چوتھی کی ہے اور طنز کے تیر بر سائے ہیں وہ کہتے ہیں:

جَاءَ جَهَالًا بِأَمْرِ رَجِيْتُمْ ضِعْفٌ ضِعْفِيَّه قَسْوَةٌ وَ اسْتَدَادًا^۲

(ترجمہ: ہمارے جاہل لوگ ایک بھونڈا کام کر بیٹھے اور تم نے تو اس سے کئی گنازیاہ سنگدلی اور رُائی کا مظاہرہ کیا۔)

دوسرے تمام مصری شعر کے عکس انہوں نے اس حادثہ کو تازیانہ بتلایا ہے اور اسے

۱. Modern Arabic Literature, John A. Haywood, P. 88,

۲. دیوان حافظ ابراہیم، (جلد دوم)، ص۔ ۲۰۔

ایک ایسی تحریک قرار دیا ہے جس سے قویں بیدار ہو جاتی ہیں اور ان کے اندر ظلم و جبر کے خلاف سینہ سپر ہونے کا جذبہ و حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے۔

تقریباً تمام ناقدین نے اس سلسلے میں حافظ ابراہیم کی صراحت بیانی اور انسانی طلاقت کا کھلے لفظوں میں اعتراف کیا ہے اور ان کے قصیدے کو دیگر تمام شعراء کے ان قصائد پر فوقيت دی ہے جن میں حادثہ نشوائی کے واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے۔

اُن کی شاعری میں ہر طبقے کی معاشرت اور زندگی سے تعلق رکھنے والے متعدد پہلوؤں کی رنگارنگ تصویریں ملتی ہیں۔ ہر قسم کے اور ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے رجحانات و میلانات کو دیدہ وری اور بصیرت کے ساتھ تحلیلِ نفسی کے انداز میں پیش کرنا حافظ ابراہیم کی اپنی خصوصیت ہے۔ اُن کی ذات اُن کے اپنے ارگرد کے ماحول میں اس طرح رچی بسی ہوئی تھی کہ اگر یہ کہا جائے کہ انہیں شاعری کی تحریک اپنی ہی ذات سے ملی ہے تو بے جانہ ہوگا۔ وہ اپنی زندگی اور اپنے ماحول کا ایک ایسا خاکہ تیار کر کے چلے گئے جس کے بارے میں ڈاکٹر منہ جبین اختر لکھتی ہیں:

”كان حافظ أبراہیم اکبر شاعر في عصره من كبار شعراء“

المصريين ولا يفضلهم الا أحمد شوقي، وفرض قصائد كثيرة من المظاهرة

الاجتماعية“ و كان شاعر الوطنية و شاعر الشعب و شاعر السياسة والا

جتمع“ ولا نظير له في شعراء عصره“^۱

(ترجمہ: حافظ ابراہیم اپنے زمانے کے مصر کے بڑے شعراء میں ایک عظیم شاعر تھے۔ احمد شوقي کے علاوہ کوئی ان سے بڑھ کرنہ تھے۔ اُس نے اجتماعی مسائل پر بہت سارے قصائد کہے۔ وہ وطنی اور قومی شاعر تھے اور ساتھ ہی سیاسی و اجتماعی شاعر تھے۔ اپنے معاصرین میں اُس کا کوئی ہم پلہ نہ تھا۔)

حافظ ابراہیم اپنی طرح کے وہ واحد شاعر ہیں جو قوم کے اعلیٰ وادنی طبقے کی رگ رگ سے واقف ہو کر ایسے طبیب بن گئے کہ ہر مرض کا ادراک حاصل کر لیا اور اس کے علاج کے لئے اپنی سخن دانی کو پیش کیا۔

اُنہوں نے اپنے اشعار سے مختلف سماجی تحریکوں کی حوصلہ افزائی کی۔ قسم امین کی تحریک آزادی نسوال کی افادیت سمجھنے اور اس سے مطمئن ہونے کے بعد اُنہوں نے اپنے خوبصورت اشعار کے ذریعے مصر کے لوگوں کی توجہ عورتوں کی ترقی اور ان کی تعلیم و تربیت کی طرف مبذول کرائی۔ اُنہوں نے تحریک نسوال سے مرتب ہونے والے اثرات کے نغمے گائے۔ اس ضمن میں اُن کا ایک شعر ان دنوں عوامی حلقوں میں اس قدر مقبول ہوا کہ عوامی نعرہ بن گیا۔

الأَمْ مَدْرَسَةٌ إِذَا عَدَ دَهَا أَعْدَدَ شَعْبًا طَيْبَ الْأَعْرَاقِ

(ترجمہ: ایک مدرسے کے متوازی ہے اگر اس کو علم و آگئی سے راستہ کیا تو آپ نے ایک قوم کو منوار احمد کی جڑیں پیوستے ہوں۔)

علم کی منفعت کے سلسلے میں حافظ ابراہیم کا یہ خیال ہے کہ وہ ان تمام علوم کو ناکارہ اور ناپسندیدہ سمجھتے تھے جن کے ذریعے ظالم اور جابر لوگ انسانیت کے کشت و خون کا ڈرامہ کھیلتے ہیں۔ وہ اس علم کو بے وقت سمجھتے تھے جس کا مقصد عالم انسانیت کی تباہی ہو۔ اُنہوں نے اپنے اس طرح کے خیالات کا اظہار اپنے ایک قصیدہ "الحرب العظیمی" میں بڑے ہی دل نیشن انداز میں کیا ہے۔

وَلَقَدْ خَسِبْتُ الْعِلْمَ فِينَا نِعْمَةً تَأْسُوا الضَّعِيفَ وَرَحْمَةً تَدْفَقُ

إِنْ كَانَ عَهْدُ الْعِلْمِ هَذَا شَأنَهُ فِينَا فَعَهْدُ الْجَاهْلِيَّةِ أَرْفَقُ

(ترجمہ: میں نے علم کو کمزور کو لپیٹنے والی نعمت اور پھوٹنے والی رحمت سمجھا، اگر علم کے دور کی یہ شان ہو تو پھر

زمانہ جاہلیت ہمارے لئے زیادہ رحمت والا ہے۔)

اس قصیدے کے آخری شعر میں یہ بات صاف طور پر عیاں ہو جاتی ہے کہ حافظ ابراہیم یورپ کی سائنسی اور علمی ترقی کو انسانی نسل کے لئے تباہ گن تصور کرتے تھے۔ کیونکہ بقول ان کے اس علم کا مُدعا و مقصد منافع کمانا اور کسبِ مال تھا۔ اس کے ذریعے انسانوں کے لئے آرام اور آسائش کے طریقوں کو ڈھونڈنا اور دریافت کرنا نہیں تھا بلکہ اس کا مقصد انسانیت کو لوٹانا اور ان پر ظلم ڈھانا تھا۔

حافظ ابراہیم کو اپنے ملک مصر سے بے حد پیار تھا۔ ان کا قصیدہ "مصر تحدث عن نفسها" مصر کی عظمت رفتہ اور ماضی کے راز بیان کرنے میں اپنی مثال آپ ہے۔

”وقف الخلق ينظرون جميعاً
كيف أبني قواعد المجد و حدي
— وبناء الاهرام في سالف الدهر ركfonyi الكلام عند التحدى“

(ترجمہ: تمام لوگ یہ دیکھتے ہوئے کھڑے ہوئے کہ میں اکیلا اس طرح سے مشرف اور بزرگی کے قواعد وضع کروں زمانہ قدیم میں اہرام تعمیر کرنے والے میرا چلیج کرنے کے لئے کافی ہے۔)

اس قصیدے کی اہمیت کے بارے میں احمد ہیکل یوں رقمطراز ہیں:

”نَشَمْ مِنْهُ اعْتِبَارُ الْعَرَبِ غَرْبَاءَ عَنْ مَصْرَ كَالْيُونَانَ“^۱

(ترجمہ: ہم ان سے عربوں کو مصر سے اجنبی محسوس کرنے کی بوسوٹگر ہے ہیں یونانیوں کی طرح۔)

اس قصیدے کی خوبی یہ ہے کہ اس میں حافظ ابراہیم نے مصر کی تاریخ کے حقائق کو دلنشیں انداز میں منظوم زبان میں گنگنا تے ہوئے ادا کیا ہے۔

حافظ ابراہیم کی شاعری صرف قومیت اور وطنیت کے جذبات پر ہی اکتفا نہیں کرتی بلکہ اس سے بُلند ہو کر عربی اور اسلامی روحانیات کا بھی تذکرہ کرتی ہے۔ انہوں نے اپنے ایک قصیدے میں سلطنت عثمانیہ کی مدح میں جوا شعار کہے ہیں ان کے پیچھے ان کا یہ جذبہ کا فرما

۱۔ نفس المرجع، (جلد دوم)، ص ص۔ ۸۸-۹۰۔

۲۔ تطور الادب المحدث فی مصر، ص۔ ۲۴۳۔

ہے کہ اسلام کے مرکز اور منبع یعنی مکہ مکرمہ کی پاسبانی اور نگہبانی کا فریضہ انجام دینے کی صلاحیت وہی حکومت رکھتی ہے جس میں اس کی اہلیت موجود ہو اور مزید یہ بھی کہ ایسی حکومت جو اس کی اہل ہے اُس پر مکہ مکرمہ کی نگہبانی و نگرانی فرض ہے۔

”قصیدہ عمریہ“ میں حافظ ابراہیم نے خلیفۃ المُسْلِمِینَ عمر بن الخطابؓ کے فہم و فراست، عدل و انصاف، شجاعت، جاہ و جلال اور ان کی اسلام کے تیئن خدمات کا ایک دل کو موه لینے والا نقشہ کھینچا ہے۔ حافظ ابراہیم اس قصیدے میں اسلامی تاریخ بیان کرتے ہیں اور حضرت عمرؓ کو حق و صداقت کے پاسبان کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔

دراصل حافظ ابراہیم کی بحثیت شاعر مقبولیت کے پیچھے جو عناصر کا فرمائیں ان میں سے ایک بڑا عنصر ان کی شاعری میں جھلکتا ہوا اسلامی رنگ بھی ہے۔ بعض حضرات اسلام کو حافظ کی شاعری کی اساس قرار دیتے ہیں۔ وہ اپنے خوبصورت اشعار کے ذریعے سلیمانؑ کی بادشاہت کا جاہ و جلال، حضرت عیسیٰؑ کی مسیحی، حضرت یوسفؐ کا حسن و جمال اور خوابوں کی تعبیر بتانے کا مججزہ بیان کرتے ہوئے پیغمبروں کی برگزیدگی کا اظہار کرتے ہیں۔ مزید یہ کہ وہ حضرت عثمانؑ کو جامع قرآن کا خطاب دے کر اسلام کے تیئن ان کی خدمات کی تعریف اور سراہنا کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ سنانا اور بیان کرنے کے پیچھے دراصل حافظ کا یہ مقصد ہے کہ لوگ اپنے اسلاف کی روایات کو نہ بھولیں اور اسلام کے اُس زریں دور کو یاد کر کے اپنے حال اور مستقبل کو اسی طور استوار کریں۔

حافظ کے عربی زبان کی محبت میں لکھے گئے کئی قصیدوں میں ایک قصیدہ شاہکار ہے۔ یہ قصیدہ حافظ ابراہیم نے اُس وقت لکھا جب ایک عام تحریک کے دوران ایک جماعت، مصری عامیانہ بولی کو فتح و بلغ عربی زبان پر ترجیح دینا چاہتی تھی۔ اس قصیدے میں حافظ ابراہیم نے عربی

کے حال کے انسان سے گفتگو کرتے ہوئے طنز کے زہر بیلے تیر چھوڑے ہیں اور عربی زبان کے مخالفوں کا تمسخر اڑایا ہے۔ قصیدے کا مطلع یوں ہے۔

رجعت لنفسی ماتھمت حصاتی و نادیت قومی ماحبت حیاتی

(ترجمہ: میں نے اپنی حالت پر غور کیا تو میں نے اپنی عقل پر تھمت لگائی پھر میں نے اپنی قوم کو آواز دی اور مجھے

خیال ہوا کہ ابھی میں زندہ رہوں گی)

حافظ ابراہیم تمام عرب قوم کو ایک فصح و بلغ زبان یعنی ”عربی“ کی لڑی میں پروناچا ہتا تھا۔ اُس نے اس زبان کی افادیت کو زبان زد عالم کرنے کے لئے ایک نظم ”اللغة العربية“ تنعی خطہا بین اهلہا“، لکھی۔ جس میں وہ اس زبان کے شکوے اور شکایات، مسائل اور مسائل کے حل کی طرف عوام کی توجہ دلاتا ہے۔

اری لر جال الغرب عزّاً و منعة و کم عزّاً قوم بعز الگفات^۱

(ترجمہ: میں اقوام مغرب کو عزت و بلندی اور حفاظت و پناہ میں دیکھ رہی ہوں اور بارہا زبانوں کے غلبہ و قوت سے

ان زبانوں کو بولنے والی قومیں بھی غلبہ و قوت سے ہمکنار ہو گئی ہیں)

حافظ ابراہیم زبان کو اساس بنائے عرب قوم کے وحدت کی بات کرتا ہے اور یوں وہ قومیت کے چھوٹے دائرے سے نکل کر پورے عالم عرب کے لئے داعی کے طور ابھرتا ہے۔ بقول عمر فروخ:

”حافظ ابراهیم شاعر و جدانی بحس بما يحيط به مِن العالم
القريب في مصر و سائر البلاد العربية“^۲

اُن کی یہ نظم دراصل اُن لوگوں کو ایک کراچی جواب ہے جو نشاة ثانیہ کے بعد عربوں کو یہ مشورہ دے رہے تھے کہ وہ عربی زبان کے بجائے کوئی یورپی زبان اختیار کر لیں کیونکہ بقول اُن کے عربی زبان دور حاضر کے تقاضوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔

۱۔ نفس المرجع، ج۔ ۱، ص۔ ۲۵۲۔

۲۔ عمر فروخ، المنهاج الجديد في الارب العربي،الجزء الثاني، ص۔ ۲۳۸۔

اس کے علاوہ ممالک عربیہ خصوصاً شام و مصر کے اتحاد و اتفاق کی طرف انہوں نے اپنی کئی نظموں میں توجہ دلائی ہے۔ اس لحاظ سے حافظ ابراہیم بھی احمد شوقي کی طرح عرب اتحاد کے پیغمبر اور نقیب کہلانے کے حق دار ہیں۔

حافظ ابراہیم کی شاعری کا اگر مکمل طور پر جائزہ لیا جائے تو اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں صرف اپنے ارد گرد کے حالات و واقعات کی ہی خبریں رہتی تھی بلکہ اُس وقت ملکی اور عالمی سطح پر جو کچھ تبدیلیاں ظہور پذیر ہو، ہی تھیں، اُن سب کے بارے میں بھی اُسے مکمل طور پر جانکاری رہتی تھی۔ اس لئے اُن کی شاعری اُس زمانے کے شب و روز کی نہ صرف اطیف خبر تھی بلکہ اُس دور کی ایک سنجیدہ تاریخ بھی ہے۔

حافظ ابراہیم کے بارے میں بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ مقامی ملکی اور عالمی سطح کے سیاسی، سماجی، ثقافتی، معاشی اور ادبی واقعات کی تصور کیشی کرتے ہوئے گویا ”جهان بینی“ کا دشوار تر کام انجام دے رہے تھے۔
حافظ ابراہیم بحیثیت قومی شاعر:-

حافظ ابراہیم خالص مصری تھا۔ وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے اور اپنے دل کے اندر قومی جذبہ سمائے ہوئے بھی، دونوں صورتوں میں وہ مصری رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ قومیت اُس کے خمیر میں رپھی بسی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے قوم کے احساسات اور جذبات کو اپنی شاعری کی زبان عطا کی۔

اگر ہم اُس کے قومی شاعر ہونے کا اندازہ صرف اُس کے شائع شدہ دیوان میں درج اشعار پر کرنے لگے تو نہ صرف نا انصافی ہوگی بلکہ اُس صورت میں ہمیں حافظ ابراہیم کے اندر موجود قومیت کے جذبات و احساسات کی گہرائی اور طوفان کا مکمل طور پر اندازہ بھی نہ ہو سکے گا۔
اس لئے اُن لا تعداد اشعار کو بھی ذہن میں رکھنا ہو گا جو کہ اُس نے مصلحتاً یا کسی اور سبب سے اپنے

دیوان میں نہیں سجائے اور ساتھ ہی ساتھ ان اشعار کو بھی مد نظر رکھنا ہوگا جو کہ اُس نے مختلف مجالس، نجمنوں اور نشستوں میں سُنا کر لوگوں کے دلوں کو گرمایا۔

حافظ ابراہیم کی قومی شاعری میں ایک ایسے مصر کی حسین تصویر تراشی گئی ہے جو کہ اپنے فرعونی جاہ و جلال کی داستان زبان حال سے سُنا رہا ہے۔ جس میں مصریوں کی سپہ گری، سیاست و قانون سازی اور دوسرے فنون میں مصریوں کی عظمت رفتہ کے نقش بڑے ہی تکھے انداز میں ابھارے گئے ہیں۔ اس میں صرف مصر کی عظمت کا خمار ہی نہیں بلکہ مصر پر یلغار کرنے کی نیت رکھنے والوں کے لئے اپنی حد میں رہنے کی لکاڑ بھی ہے۔

اُنہوں نے اپنے اشعار میں نہ صرف اپنی قوم پر ہور ہے ظلم و ستم اور جذبہ آزادی کی سرفروشانہ اداؤں کا نقشہ کھینچا ہے بلکہ عظیم سے عظیم تر مصر بنانے کے لئے اپنے قیمتی مشوروں سے بھی نوازا ہے۔ ایک ایسا ہی قصیدہ جو کہ اپنی طرز کا انقلابی تھا اور خالص مصری میں تخلیق شدہ تھا، حافظ کی اپنی قوم اور ملک کی خاطر محبت اور اُس کی اپنی شعری عظمت بیان کرتا ہے آج تک مصریوں کی زبان پر ہے۔ اس قصیدے کا مطلع مصر کی حب الوطنی کی مثال بن گیا ہے۔

وقف الخلق ينظرون جميعاً كيف أبني قواعد المجد و حدي

(ترجمہ:- تمام لوگ یہ دیکھتے ہوئے کھڑے ہوئے کہ میں اکیلاں طرح سے مشرف اور بزرگی کے قواعد وضع کروں۔)

حافظ ابراہیم وہ شاعر ہے جو اپنے وطن کی محبت میں جنون کی حد تک گرفتار ہے۔ اُس کے لیل و نہار ہمیشہ وطن کی فکر میں گردش کرتے نظر آتے ہیں۔

لعمرك ما أرقـت لغير مصر ومالي دونها أـمل يرامـ

(ترجمہ:- تیری قسم میں مصر کے علاوہ کسی کے لئے نہیں جا گا اور نہ ہی مجھے اس کے علاوہ کوئی چاہت ہے جس کا قصد کیا جائے۔)

وہ پر دلیں جا کر مصر کی ہوا وؤں کے لئے ترستا ہے اور مسحور گن نغمے گا گا کر پوری قوم کے دل کی تاروں کو چھیڑتا ہے اور پھر اس کی عظمت کے گیت گا کرا یسے راز افشا کرتا ہے کہ اُس کی سخن دانی اپنے آپ میں ایک مثال بن کر رہ جاتی ہے۔

حافظ ابراہیم اپنی قوم کے رنج و محن اور آلام و مصائب کی تصویر کشی میں اپنا کوئی بھی ثانی نہیں رکھتا۔ ظلم و ستم کی چکلی میں پسے ہوئے لوگوں کے زخموں پر پھاہار کھنے اور ان کی داستانِ الٰم بیان کرنے میں اُسے ملکہ حاصل تھا۔ بقولِ طه حسین:

”ولَكُنْ شَوَّقِيَ لَمْ يَلْعُجْ مَا بَلَغَ حَافِظُ مِنَ الرِّثَاءِ، وَلَمْ يَحْسُنْ مَا

أَحْسَنَ حَافِظُ مِنْ تَصْوِيرِ نَفْسِ الشَّعْبِ وَ آلَامَهُ وَ آمَالَهُ وَلَمْ تَقْنَ مَا أَتَقَنَ

حَافِظُ مِنْ إِحْسَاسِيَ الْأَلَمِ وَ تَصْوِيرِ هَذَا الْأَلَامِ وَ شَكْوَى الزَّمَانِ“^۱

(ترجمہ: لیکن شوقی رثاء میں حافظ کے مرتبہ کونہ پہنچ پایا اور نہ ہی حافظ کی طرح شوقی قوم کی نفسانیت کی تصویر کشی ان کے دکھو دردار ان کے مقاصد کو بخوبی بیان کر پایا اور نہ ہی حافظ کی طرح وہ الٰم کے احساس اس کی تصویر کشی اور زمانے کا شکوہ بیان کرنے پر ماهر ہے۔)

ڈاکٹر عصمت مہدی کے مطابق:

"His art lies in transforming individual grief to social loss"^۲

حافظ ابراہیم کی شاعری نہ صرف اپنے دور کا آئینہ ہے بلکہ یہ اپنے دور اس کے خدوخال بھی ابھارتی ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں مصری انقلاب کے گیت گائے، قوم کے عظیم اور بے لوث رہنماؤں کے کارہائے نمایاں کی مدح سرائی کی اور ان کے پچھڑنے پر مرثیے بھی کہے۔ انہوں نے آزادی کی تحریک میں ہور ہے مظاہروں کی ترجمانی کی، استعماریوں کی دشمنی اور دباؤ کے تحت ہونے والی کارروائیوں سے پوری قوم کو باخبر رکھا اور مصر میں حکومت کرنے والے انگریز

۱۔ حافظ و شوقی، ص ۱۹۸۔

حکمرانوں کی نفیسیات بیان کی۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں عوام نے ”قومی شاعر“ کے رتبے سے نوازا۔ انہوں نے قوم کی ترجمانی میں اپنی شاعری کے ذریعے ایسا پُر لطف ماحول تیار کر لیا تھا کہ احمد شوقي جیسے اعلیٰ پایہ کے شاعر کو اُس کے نقشِ قدم پر چلنے کی آرزو ہوئی بلکہ تر غیب ملی۔

حافظ ابراہیم کی فطرتًا حساس ذہنیت نے نہ صرف انہیں قوم کو پیش آنے والی مصیبتوں کے حال کو بیان کرنے کے سلسلے میں باشعور بنادیا بلکہ انہیں استعمار کے خلاف سینہ سپر ہونے کے لئے بھی تیار کیا۔ وہ اپنی شاعری میں نہ صرف ان کی غلطیوں پر انہیں ٹوکتا اور سرزنش کرتا ہے بلکہ انہیں بُرے انجام سے خبردار بھی کرتا ہے۔ یوں وہ اپنی شاعری کو سیاسی حکمت عملی کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ اس بارے میں شوقي، حافظ ابراہیم پر تبصرہ کرتے ہوئے یوں گویا ہوتے ہیں ۔

”وهو بحق يعد اول من ابتكر الصورة السياسية الوطنية“^۱

(ترجمہ: اور حقیقت یہ ہے کہ وہ پہلا شخص ہے جس کا شمار طفی اور سیاسی تصویر کشی میں کیا جاتا ہے۔)

جدید عربی ادب کے مورخین کا کہنا ہے: ”وقد عُرِفَ حافظاً إِنَّهُ لَمْ

تَيُوكَ حادثةً مِنَ الْحَوَادِثِ الْهَامَةِ فِي التَّارِيخِ الْمَصْرِيِّ دُونَ أَنْ يَمْسِيرَ إِلَيْهَا“^۲

(ترجمہ: حافظ اس بات کے لئے مشہور ہے کہ اس نے مصری تاریخ کے اہم حوادث میں کوئی حادثہ نہیں

چھوڑا جس کی طرف وہ نہ لپکا ہو۔)

اس عبارت سے یہ بات صاف طور پر عیاں ہو جاتی ہے کہ حافظ ابراہیم نے اپنی شعری صلاحیتوں اور قابلیتوں کا استعمال اپنے ملک و قوم کی خدمت اور بھلائی کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ وہ اپنے ارڈر ڈیپور پذیر ہونے والے معمولی سے معمولی واقعہ کو اپنے زور بیاں کے سہارے اس قدر اہم بنادیتے تھے کہ ایک طرف قوم کے اندر جوش و جذبہ عروج پکنیج جاتا تھا اور وہ جذبہ تقویت سے سرشار ہو کر

۱۔ مقومات الشعر العربي الحديث والمعاصر، ص۔ ۹۷۔

۲۔ ڈاکٹر جمیل سعید وغیرہم، تاریخ الادب العربي الحديث، ص۔ ۹۷۔

ایک ہی لڑی میں پروجاتے تھے تو دوسری طرف وقت کے حکام اپنی ہی کرتو تو پر بلبل اٹھتے تھے۔

حافظ ابراہیم نے اپنی قومی شاعری میں دریائے نیل کو وحدت کی اکائی اور رمز بنا کر مصری قوم کو ایک لڑی میں پروزے کی کوشش کی ہے۔ دریائے نیل سے حافظ ابراہیم کا تعلق جنون کی حد تک تھا۔ ان کی پیدائش سے لے کر ان کی وفات تک دریائے نیل ان کے جذبات و احساسات پر حاوی رہا ہے۔ انہوں نے متعدد بار دریائے نیل کو بنیاد بنا کر مصریوں کے اندر جوش و جذبہ پیدا کرنا چاہا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے دریائے نیل کی لہروں، اس کی خاموشی، اس کی تندی و تیزی، اس کے بلوریں پانیوں کی تعریف کر کے اسے خوبصورتی، دلکشی اور جاذبیت کا شاہکار نمونہ بنایا کر پیش کیا ہے۔

اولم يَكْنَ لَكَ يَا مُلْكُ مِصْرٍ وَ نَيْلًا
يَنْبَنِابُ يَيْنَ مُرْوِجَهَا الْفِيَاجُ
مَطْلُولُ السَّرَّ حَاتٍ وَ الْأَرْوَاحُ
مُنْصُورَةُ الْجَنَّاتِ جَالِيَّتِهِ الرُّبَا

(ترجمہ:- کیا تمہارے لئے ملک مصر اور اس کے نیل، ایسے پر دریا پر میدان نہیں ہیں جو نہروں کے بعد تسلسل سے ابھر کر بہتے ہیں، اور منصورہ اور اس کے ہریا لے باغات و میدان، جن میں شبنم کی ہریا لی اور روحوں کی تازگی کا سامان ہے۔)

حافظ ابراہیم نے اپنے قومی جذبات و احساسات کے اظہار کے لئے دریائے نیل کو بطور رمز استعمال کیا ہے۔ اپنے دیوان میں انہوں نے اس دریا کے نام کو اس قدر بار بار جگہ دی ہے کہ علمائے ادب نے حافظ ابراہیم کو ”شاعر النیل“، ”کاظم عطا کیا ہے۔

إِلَّنِيلِ مَجْدُ فِي الزَّمَانِ مُوَثَّلٌ
مِنْ عَهْدِ (آمُون) وَعْهَدِ (فَتَاحٍ)^۲

(ترجمہ:- دریائے نیل کو عہد آمون اور عصر فتاح سے ہی مضبوط بنیادوں پر قائم شرف حاصل ہے۔)

۱۔ دیوان حافظ ابراہیم، (جلد دوم)، ص۔ ۱۰۰۔

۲۔ ایضاً۔

حافظ ابراہیم کی قومی شاعری کے بارے میں ڈاکٹر شوقي ضیف کہتے ہیں:

”وہ عوام کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے ان کے دلوں میں بھڑکنے والے انقلاب کے شعلوں کی ترجمانی کرتے“^۱

الغرض یہ کہنا بالکل بجا ہوگا کہ حافظ ابراہیم نے اپنی شاعری کو اپنی قوم کی اخلاقی اصلاح اور ان کی تکالیف کے ازالہ کے لئے ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا اور ایک سچے قومی شاعر کی بھی سب سے بڑی پہچان ہے۔

حافظ ابراہیم کی شاعری میں عناصر و رجحانات:-

حافظ ابراہیم کی شاعری قدیم اور جدید عناصر کا ایک حسین، معتدل اور خوشگوار امتزاج ہے۔ ان کے اسلوب اور ہیئت میں قدامت پسندی کا زیادہ چلن ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ جدید تشبیہات واستعارات کا عام استعمال بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ زبان کی پختگی، تراکیب کی جزالت اور انداز بیان کی ممتازت ان کے اسلوب کے خاص عناصر ترکیبی ہیں۔ جملوں کی رکاکت اور الفاظ و کلمات کے غلط اور نامناسب استعمال سے ان کی شاعری مستثنی ہے۔ محکمات، جذبات، نگاری اور منظر کشی بھی ان کے خاص عناصر میں شامل ہیں۔ وہ چھوٹی چھوٹی جزئیات کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔

حافظ ابراہیم کی نظموں میں بے با کی اور طنز و تمثیر کا عصر نمایاں ہے جبکہ ان کے قصائد میں استہزا و تفحیک کا انداز حاوی ہے۔ ان کی شاعری میں جدید اختراعات اور نئے مضامین دیکھنے کو ملتے ہیں۔ زور بیانی، جزالت اسلوب، صراحة، قول اور اصالحت فلکر ان کی شاعری کے گوہر ہیں۔

حافظ ابراہیم نے شاعری کے قدیم موضوعات مثلاً مدح، فخر، ہجوا و نسیب و تشبیب کو نئے خیالات و مضامین سے آرائستہ و پیرائستہ کیا ہے۔ انہوں نے مرثیہ و نالہ شیوں جیسے موضوعات کو طنزی

^۱ ڈاکٹر شوقي ضيف، ترجمہ: ڈاکٹر شمس کمال الحمد، جدید عربی ادب، (الكتاب انٹرنیشنل، نئی دلی، اشاعت، جنوری ۲۰۰۴ء)، ص۔ ۹۱۔

اور قومی جذبات کے اظہار کے لئے مخصوص کیا۔ اُن کے مرثیوں کی یہ خصوصیت ہے کہ ان میں تکلف اور تصنیع کا کہیں پر گز نہیں ہے بلکہ اُن کے ہر لفظ میں سچائی اور صداقت کا عنصر نمایاں ہے۔ اُنہوں نے قصیدہ گوئی کے فن میں نئی روح پھونک دی۔ قلبی واردات کی بعینہ مثل اور غلو سے پاک تعبیر، قوم کی امنگوں اور آرزوؤں کی صحیح تفسیر اور زمانے کی اچھائیوں اور بُرا یوں علاوہ ازیں اپنے گردوبیش میں رونما ہونے والے ہر چھوٹے بڑے واقع کی مکمل عکاسی میں کوئی بھی اُن کا ثانی نہ تھا۔

اُن کا کلام تکلف و تصنیع کی پاکی کے علاوہ فصاحت و بلاغت سے لبریز ہے۔ اُنہوں نے رکیک تشبیہات اور بے جامد حوصلہ سے ہمیشہ گریز کیا ہے۔

اُن کی شاعری موسیقی کے ساز و آہنگ اور سوز و گدختگی کا رس گھولتا ارتعاش ہے۔ وہ چونکہ خود بھی غمِ دوراں کے ستائے ہوئے تھے اس لئے قوم کے رنج و محن، کسک اور چھبھن کو اپنے حسین احساسات کے ساتھ سمجھتے تھے اور اسکی عکاسی اپنے کلام میں اس سوز و گداز سے کرتے تھے کہ گویا اپنے غموں کی تپیش کو اشکوں میں بہار ہے ہوں۔ اُن کے اشعار میں اثر پذیری کی صلاحیت کمال کی حد تک ہے۔ اس پر طریقہ کہ اُنہیں الفاظ پر کامل دستگاہ حاصل تھی اور طرزِ بیان سادگی، سیلیں اور دلکشی سے پُر تھا۔ بقول ڈاکٹر ہیکل ”وان کان شوقی اعظم شعراء عصرہ فناً فحافظ اکثر هم تصویراً لالام الشعب“^۱

(ترجمہ: اور اگر شوقي اپنے زمانے میں فن شاعری کے اعتبار سے عظیم شاعر تھے تو حافظ قوم کے غم و الم کی تصویر کیشی میں سب سے بڑھ کر تھے۔)

اپنے خیالات و افکار کے دوران حافظ ابراہیم کی توجہ حُسْنِ لفظ کے ساتھ ساتھ حُسْنِ معنی پر بھی ہوتی تھی۔ اُنہوں نے کبھی بھی اپنے افکار کو الفاظ کے گور کھدھندوں میں چھپانے کی

¹ ڈاکٹر احمد ہیکل، تطور الادب المحدث فی مصر، ص۔ ۱۲۹۔

کوشش نہیں کی بلکہ اپنے نظریات اور معتقدات کو بڑی صراحةً اور وضاحت کے ساتھ پیش کیا۔ اُن کے یہاں لفظی صنائع وبدائع کا گزرنہ تھا اور نہ اُن کی شاعری لفظی صنعت گری کا نمونہ تھی بلکہ اُنہوں نے اپنے اشعار کو قومی، سماجی، معاشرتی، اخلاقی اور مذہبی اصلاحات کے لئے اکسیر کے طور پر استعمال کیا ہے۔

اُن کے اشعار ثقلِ الفاظ، پیچیدہ تراکیب اور مشکل کلمات سے مبرراً تھے بلکہ اُن پر سچائی اور صداقت کی قلعی چڑھی ہوئی تھی۔ اُن کے کلام کی سب سے بڑی خوبی اور خصوصیت یہ ہے کہ اُنہوں نے حدیثِ ذات کو حدیثِ روزگار یا غمِ ذات کوغم روزگار میں ڈھال دیا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ حافظ ابراہیم کی شاعری کی روح اور موضوعات اُن کی ماضی کی انفرادی یادداشتوں کی منتشر صدائی بازگشت ہیں اور کچھ حال کی اجتماعی آراء افکار کا اقتباس ہیں، تبھی تو اُن کے دیوان کے بیشتر اوراق سے اُن کے زمانے کے قومی، سماجی، معاشرتی، سیاسی اور مذہبی مسائل کا شعور ہوتا ہے۔

حافظ ابراہیم پر تنقید:-

اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ دو رجدید کے شعراء نے عربی شاعری کو صنائع و بدائع کی گلکھیوں، مجمم و مہمل حروف کی ملاوٹ، حساب و نمبرات اور ریاضی کی پھیلیوں، لفظی بازیگری اور زبان کے چٹکڑوں سے نکال کر جذبات و احساسات کی پُر لطف اور معطر فضا میں پہنچا دیا اور یہ بھی سچ ہے کہ عوامی رجحانات کی پیش کشی کی بدولت عربی شاعری اپنے دوران سے کاندھا ملانے لگی۔ لیکن معاملہ اس کے برعکس بھی ہے۔ جدید شعراء بھی الزامات سے مبرأ نہیں۔ اُن پر پہلا الزام یہ ہے کہ اُنہوں نے اپنی شاعری میں عوام کو پیش نظر کھا، جس کی وجہ سے اُن کی

شاعری عباسی عہد کے معیار سے نیچے گئی اور اس کافنی ارتقا رک گیا۔ دوسرالزام یہ ہے کہ عوام کی حد سے زیادہ توجہ اور پسند کا خیال رکھنے کی وجہ سے آہستہ آہستہ شاعر کی اپنی ذات اور شخصیت درمیان سے غائب ہو گئی۔ کیونکہ ان کے لئے یہ امر ضروری بن گیا تھا کہ ہر رونما ہونے والے حادثے یا واقعے پر کوئی نہ کوئی نظم، قصیدہ یا مرثیہ لکھیں اور پھر واقعے کا حقیقی تاثر دکھانیکے بجائے ایسے تاثرات پیش کریں کہ جو عوام کے دلوں کو چھوکیں اور جو ان میں مقبول ہو سکیں۔ یہ الزامات خصوصی طور پر حافظ ابراہیم پر عاید ہوتے ہیں۔ ان پر یہ الزام بھی ہے کہ اگر انہوں نے ایک طرف ہیئت کی قدامت پسندی سے شاعری کی بنیادی قدروں کی بازیافت اور بحالی میں مددی تو دوسری طرف ان کی پرانی ہیئت، نئے تجربات کی راہ میں رکاوٹ بھی بنی۔

حافظ ابراہیم اور ان کے ہم عصر شعراء کے اسلوب پر تنقید کرنے والوں میں عقاد اور مازنی ہمیشہ پیش پیش رہے۔ انہوں نے ترقی پسند شعراء بشمول حافظ ابراہیم پر یہاں تک الزام لگایا کہ ان کے اشعار میں جو ظاہری لاطافت ہے وہ اصل میں قدیم شعراء کی مر ہوں منت ہے کیونکہ ان کے بقول ترقی پسند شعراء کا کلام قدماء کی شاعری کا لفظی الٹ پھیر ہے۔

عقاد اور مازنی نے حافظ ابراہیم اور ان کے ہم عصروں کو اپنے احساسات، جذبات اور غمِ دوراں کے نقیب و ترجمان ماننے سے انکار کر دیا ہے۔

”شعر حافظ“ جو کہ مازنی نے لکھی ہے، اس میں مازنی نے حافظ ابراہیم کی شاعری پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کی شاعری شکری کی شاعری کے مقابلے میں کم تر ہے۔ انہوں نے شکری کی شاعری کو جدید عربی شاعری کی بہترین مثال قرار دیتے ہوئے اسے فطری شاعری کہا ہے جو کہ مصنوعیت سے مبراء ہے۔ مزید یہ کہ شکری کی شاعری کو انہوں نے اپنے غمِ دوراں اور دیگر

مسئلوں کا آئینہ قرار دیا ہے۔ جبکہ اس کے مقابل میں حافظ ابراہیم کی شاعری کو انہوں نے سیاسی اور اخباری شاعری کا نام دیتے ہوئے کہا ہے کہ اُن کی شاعری میں انسانی جذبات و ذات کے بجائے روزمرہ کے حقیر مسائل پر بحث ہوتی ہے۔ انہوں نے حافظ ابراہیم کو ایک کمزور شاعر گردانہ ہوئے اُن کے کلام کو سچائی سے پرے سرقات اور لغوی خامیوں سے بھر پور شاعر کے لطیف و حسین جذبات و محسوسات سے عاری اور ”احالہ“ سے بھر پور قرار دیا ہے۔ انہوں نے حافظ ابراہیم کو ایک ایسا تقليدی شاعر کہا ہے جس کے کلام میں کائنات کی خوبصورتی کی تصور بھی نظر نہیں آتی۔ علامہ اقبال کی شاعری کے ابتدائی مراحل:-

اقبال نے شعرگوئی کی شروعات اپنی مادری زبان پنجابی سے کی لیکن استادِ مکرم مولوی میر حسن نے اُن کی توجہ اردو شاعری کی طرف مبذول کروائی اور انہیں اس طرف آخر کار راغب کر ہی لیا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب صوبہ پنجاب میں اردو شعرو شاعری کی کونسلیں پھوٹنے لگی تھیں لیکن ادب و شاعری کے لحاظ سے لاہور سب سے بڑا مرکز تھا۔ دلی، لکھنؤ اور اطراف کے کئی شاعر یہاں آ کر بس گئے تھے۔ اقبال جیسے ہی شعرو سخن کی دُنیا میں وارد ہوئے تو انہیں حوصلہ افزائناً ماحول ملا اور اُن کی شاعری کی نشونما کے لئے ایک موافق فضامل گئی۔

اقبال اردو شاعری کے اپنے ابتدائی مراحل میں دلی سے آ کر لاہور میں بستے والے مرزا ارشد سے مستفید ہونے لگے مگر بعد میں وہ با ضابطہ طور پر داٹ غدھوی سے اصلاح لینے لگے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے اصلی سفر سے چند برس پہلے دوستوں کے اصرار پر کئی مشاعروں میں اپنی شاندار آواز میں ترجم سے اپنی غزلیں سُنا کیں تو لوگوں کو اُن کے کلام میں رچی بسی شوخی اور بے ساختہ پن بہت پسند آیا۔ انہمِ حمایت الاسلام لاہور کے دو سالانہ جلسوں میں انہوں نے بالترتیب اپنی نظمیں ”نَلَهَ يَتَيمٌ“

اور ”لبر گہر بار“ پڑھیں۔ جن پر انہیں ہر طرف سے دلخیسین ملی۔ اسی طرح کے ایک مشاعرے میں جس کی صدارت مرزا ارشد کر رہے تھے اقبال نے اپنے دوستوں کے اصرار پر یہ غزل پڑھی ۔

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لئے قطرے جو تھے مرے عرقِ افعال کے
تو مرزا ارشد صاحب نے کلام کی چاشنی اور شیرینی پر سرد ہختے ہوئے یہ پیشِ گوئی کی کہ
اس نوجوان شاعر کا مستقبل نہایت ہی درخشش ہو گا۔

”کہا جاتا ہے کہ اکثر شاعروں اور نقادوں نے جب یہ سننا کہ یہ شعر ایک نوجوان نے کہا ہے جو حال ہی میں لا ہو رہا یا ہے تو انہوں نے ارادہ کر لیا کہ شعر کہنا چھوڑ دیں اور سب کے سب متفق اللفظ ہو کر پُکارا ٹھے کہ اقبال، غالب کے بعد اُردو کا سب سے بڑا شاعر ہے۔“ ۔^۱

اقبال کی شاعری کا باقاعدہ آغاز ان کی نظم ”ہمالہ“ سے ہوا جو کہ رسالت ”مخزن“ میں اپریل ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی۔ یہ نظم حالانکہ انگریزی خیالات اور فارسی بندشوں کی حسین آمیزش تھی مگر اس میں وطن پرستی کی چاشنی گھلی ہوئی تھی اور مذاقِ زمانہ اور ضروریات وقت کے عین موافق تھی اس لئے بہت زیادہ پسند کی گئی۔

اقبال کی شاعری کے ادوار: (پہلا دور ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۵ء تک:-)

اس دور کے آغاز میں اقبال غزلیں کہتے رہے جن میں چند ایک غزلوں پر داغِ دہلوی کا رنگ، زمین، چاشنی اور تکراری کے مضامین کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔

—
نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

۱۔ نیرگ خیال، (اقبال نمبر)، ص۔ ۱۷۹۔

یہ غزل دَاغ کے رنگ میں ہے۔ اسی طرح کئی اور مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

مثلاً

تیرے عشق کی انہتا چاہتا ہوں مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
علّامہ اقبال نے پہلے پہل دَاغ کا رنگِ خن ہی اختیار نہیں کیا بلکہ اُن کی زمین کو
بھی برتا ہے۔

مثلاً..... دَاغ

ان آنکھوں نے کیا کیا تماشانہ دیکھا

حقیقت میں جو دیکھنا نہ تھا نہ دیکھا

اقبال

کمی جزوِ فطرت ہے اہلِ ستم کی

کبھی ہم نے خخبر کو سیدھا نہ دیکھا

دَاغ

بزمِ گلشن میں نہ کھلنا گل تر کی صورت

جاوَ بجلی کی طرح آؤ نظر کی صورت

اقبال

تو نہاں مجھ سے مرے دَاغ جگر کی صورت

میں نہاں تجھ سے ترے موئے کمر کی صورت ۱

لیکن اقبال نے کلام ترتیب دیتے وقت داع کے رنگ کی غزلوں کو شامل کلام نہ کیا۔
حالانکہ انہوں نے داع کی شاگردی پر فخریہ لمحے میں ایک مقطع میں عرض کیا ہے۔

شیم و تشنہ ہی اقبال کچھ اس پر نہیں نازاں

مجھے بھی فخر ہے شاگردی داع سخنداں کا

جبکہ داع نے علاًما اقبال کی چند ایک غزلوں پر ہلکی سی اصلاح کر کے یہ کہلا بھیجا کہ اُن کا
کلام پختہ ہے اور اس میں اصلاح کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

اس دور میں اقبال نے بچوں کے لئے بہت سی نظمیں لکھیں جیسے کہ ”ایک مکڑی اور مکھی“،
”ہمدردی“، ”ایک پہاڑ اور گلہری“، ”ایک گائے اور بکری“، ”بچ کی دعا“، ”ماں کا خواب“،
”پیامِ صبح“، ”عشق اور موت“، ”رخصت اے بزمِ جہاں“، ”غیرہ“ وغیرہ۔

ان نظموں کے بارے میں اقبال بذات خود یہ اعتراف کرتے ہیں کہ یہ نظمیں یورپ کے
شعراء جیسے کہ ٹینی سن، ایمرسن، گوئیٹے وغیرہ کے کلام سے ماخوذ ہیں۔ طالب علمی کے زمانے میں
اقبال یورپی شعراء کی تقلید کی کوشش کرتے تھے۔

انہوں نے مشی سراج الدین کے نام ۱۹۰۳ء کو لکھے گئے ایک خط میں لکھا:

”مِلِثُن کی تقلید میں کچھ لکھنے کا ارادہ مدت سے ہے اور اب وہ وقت قریب

معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ ان دونوں وقت کا کوئی لحظہ خالی نہیں جاتا۔ جس میں اس کی فکر نہ ہو۔

پانچ چھ سال سے اس آرزو کو دل میں پروش کر رہا ہوں مگر جتنی کاوش آج کل محسوس

ہوتی ہے اس قدر کبھی نہ ہوئی۔“

علامہ اقبال کی ابتدائی نظموں کے بہت سے الفاظ، محاورے، تلمیحات اور خیالات پر قدیم تغزل کی چھاپ واضح نظر آتی ہے جو دراصل ان پر داغ و امیرینائی کی صحبت کا اثر ہے۔ اس دور کی شاعری کے آغاز میں انہوں نے صوفیانہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔ حالانکہ اگر بعض خیالات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو وہ ان کے فلسفہ خودی کے عین منافی ہیں۔ جس کا احساس انہیں خوبھی ہے کیونکہ بعد کے ادوار میں انہوں نے ان کی سختی سے تردید کی ہے۔ مثلاً

میری ہستی ہی جو تھی میری نظر کا پردا	اٹھ گیا بزم سے میں پرداہ محفل ہو کر
عین ہستی ہوا ہستی کا فنا ہو جانا	حق دکھایا مجھے اس نقطے نے باطل ہو کر
حلق معقول ہے محسوس ہے خالق اے دل	دیکھ نادان ذرا آپ سے غافل ہو کر

یا، ایک اور جگہ فرماتے ہیں:-

زندگانی جس کو کہتے ہیں فراموشی ہے یہ خواب ہے غفلت ہے سرستی ہے بے ہوش ہے یہ لیکن اس سے قطع نظر اس دور کے اوآخر کی نظموں میں اقبال کے فلسفہ خودی کے کئی عناصر جیسے کہ انسان کی فضیلت اور اس کی مخفی روحانی استعداد و قابلیت یعنی انسانوں کے اندر خودشناصی کا جذبہ جسے اقبال فلسفہ خودی کی اساس مانتے ہیں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ عقل و عشق کی معرکہ آرائی جس میں عشق عقل سے بڑھ کر ہے۔ خیروشر کا امتزاج یادونوں کی جنگ کہیئے اور حیاتِ جاودائی جیسے خودی کے عناصر کے کہیں کہیں واضح اور مبہم نشان ملتے ہیں۔ اس دور کی شاعری کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اقبال پر فلسفیانہ خیالات حاوی تھے۔ علاوہ ازیں اس دور کی سیاسی ہنگامہ آرائی سے متاثر ہو کر انہوں نے جذبہ وطنیت اور ہندو مسلم اتحاد جیسے موضوعات کو اپنی شاعرانہ طرزِ ادا، جذبات و احساسات، شیرینی و چاشنی اور موسیقیت

کے ساتھ پُر جوش نظموں کی صورت میں بیان کیا۔ جس سے نہ صرف ان کو ہندوؤں و مسلمانوں میں یکساں شہرت حاصل ہوئی بلکہ ان کی شاعری کی مقبولیت کو بھی چارچاند لگ گئے۔

دوسرادور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک:-

علامہ اقبال کی شاعری کا دوسرا دور ۱۹۰۵ء میں ان کے تعلیم کے سلسلے میں ولایت جانے سے لے کر ۱۹۰۸ء میں واپس اپنے ملک آنے تک محیط ہے۔ اس دور میں ان کا شاعری کی طرف شغل کم رہا۔ یہاں تک کہ ایک بار تو انہوں نے شاعری ہی چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یورپ کی چکا چوند بھری عملی زندگی میں انہیں ایشیائی طرز کی شاعری کے لئے نہ کوئی مناسبت اور نہ کوئی جگہ ملی۔ خاص طور پر انہیں یہ محسوس ہوا کہ صوفیانہ طرز کی شاعری دورِ جدید سے قطعاً میں انہیں کھاتی کیونکہ یہ رہبانتی اور گوشہ نشینی کی تعلیم دیتی ہے۔ اسی لئے اس دور میں ان کی شاعری کی تخلیقات قلیل رہیں۔

اس دور میں شاعری کے تعلق سے ان کی طبیعت میں کئی تغیرات رونما ہوئے۔ اول یہ کہ شاعری سے ان کا دل اچاٹ ہو گیا لیکن بروقت پروفیسر آرنلڈ کی ذاتی مداخلت اور ان کے سمجھانے بجھانے پر پھر سے ان کا دل شاعری کی طرف مائل ہوا۔ دوسرا تبدیلی یہ تھی کہ انہوں نے اردو کے علاوہ فارسی زبان میں بھی طبع آزمائی شروع کر دی۔ حالانکہ یورپ میں مکمل قیام کے دوران انہوں نے فارسی میں صرف دو غزلیں کہیں اور زیادہ اردو میں ہی کہتے رہے۔ تیسرا اہم تبدیلی یہ ہوئی کہ ان کی سوچ اور نظر کے زاویے بدلنے لگے اور انہوں نے شاعر کے قلب کو چھوڑ کر ایک پیامبر کا چولا پہن لیا۔ جس کی وجہ سے ان کے پیام اور طرزِ کلام میں تبدیلی واقع ہوئی۔

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے
طاڑ زیر دام کے نالے تو سُن چکے ہوتم
یہ بھی سُنو کہ نالہ طاڑ بام اور ہے۔

اس دور میں اقبال کے کلام میں ”زندگی“ کی تفسیر ہی بدل گئی ہے۔ وہ اب زندگی کو مسلسل جدوجہد، حرکت اور تنگ و دوکی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ وطنیت کے موضوع پر بھی ان کے نظریے میں تبدیلی رونما ہوتی ہے اور وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ وطنیت کے جذبے پر اسلامی قومیت کی بُنیاد نہیں رکھی جاسکتی۔ علاوہ ازیں اس دور کی شاعری میں ان کے فلسفہ خودی کے ساتھ فلسفہ بے خودی کی آمیزش بھی شامل ہو گئی ہے۔

اقبال کے اس دور کی شاعری ایک نئی امنگ، ترنگ، جوش اور ولوں سے بھر پور ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری خصوصاً اپنی نظموں میں اسلام اور مسلمان کو موضوع بحث بنا کر انہیں بھنور اور گرداب سے نکلنے کے گر اور راستے سکھلانے۔ انہوں نے مسلمانوں کے دلوں میں اپنے پُر جوش اور شیریں کلام سے ایک ایسی تمناجگائی جس سے ان کی روح میں تڑپ پیدا ہو گئی۔ یوں اس دور کی شاعری اسلامی شاعری کھلانے کی مستحق ہے۔

تیسرا دور:-

اقبال کی شاعری کا یہ دور ۱۹۰۸ء سے شروع ہوتا ہے۔ یہ دور عالمہ کے کمال کا دور ہے اور ان کی شاعری بھی بھر پور جوبن میں ہے۔ اس لحاظ سے یہ دور باقی سب ادوار میں ممتاز ہے۔ اس دور

کی شاعری میں فارسیت کا غلبہ صاف نمایاں ہے۔ شاعری میں فارسی تراکیب اور بندشوں کی بھرمار ہے۔ کئی جگہوں پر فارسی اشعار پر تصمین کی گئی ہے۔ یہاں تک کہ اردو میں لکھی گئی کئی نظموں میں بند کا آخری شعر فارسی زبان میں ہی لکھا گیا ہے۔ ”طلوعِ اسلام“ اور ”شمع اور شاعر“، جیسی نظمیں اس کا جیتا جا گتا ثبوت ہیں۔ اس دور کی شاعری میں اُن کے کلام پر خودی اور بے خودی کے موضوعات کی چھاپ ہے۔

ٹُراز کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا

خودی کا راز داں ہو جا خُدا کا ترجمان ہو جا

خودی میں ڈوب جا غافل یہ سرزندگانی ہے

نکل کر حلقة شام و سحر سے جاؤ داں ہو جا

شاعری کے اس تیسرا دور کی ابتداء میں اقبال عشقِ رسول میں غوطہ زن ہونے لگے اور اس دور کے اختتام تک یہ عشق اپنی انہتا کو پہنچ چکا تھا۔ اس کے علاوہ دیارِ حبیب جسے وہ ”سرز میں حجاز“ کہتے ہیں سے اُن کی محبت اس قدر بے اندازہ بڑھ گئی تھی کہ انہوں نے اس پاک سرز میں پر اپنے موت کی خواہش کا اظہار بڑے ہی پُرسوز اور پُر اثر انداز میں کیا ہے۔

اقبال کے اس دور کا کلام اُن کے اپنے دور کے مسلمانوں کے جذبات و احساسات کا حقیقی طور پر ترجمان ہے۔ اُن کی شاعری اپنے دور اس کے حادثات اور واقعات اور اُن کی اثر پذیر شاعرانہ طبیعت کی مکمل ترجمانی کرتی ہے جو کہ ”طلوعِ اسلام“ کی نظم لکھنے کے ساتھ ہی اپنے اختتام کو پہنچتا ہے۔

چوتھا دور:-

اقبال اپنی اردو شاعری کے تیسرا دور کے بعد فارسی شاعری میں اس قدر منہمک ہو گئے کہ ایسا گماں ہونے لگا کہ انہوں نے اردو سے ترکِ تعلق کر لیا ہو۔ نوبت یہاں تک پہنچی

کہ بانگ درا کے مقدمہ میں شیخ عبدالقدار کو علامہ اقبال کے نام یہ درخواست کرنی پڑی کہ وہ اردو کی طرف توجہ دیں کیونکہ اردو کے گیسو جو کہ بکھرے ہوئے ہیں انہیں سنوارا جائے۔ مزید یہ استدعا بھی کی گئی کہ بانگ درا کی اشاعت کسی نئے گلیاتِ اردو کا پیش خیمه ہو۔

شاید اقبال پر اس استدعا اور اس کے علاوہ ان آن گنت لوگوں کی درخواستوں کا کچھ اثر ہوا ہو کیونکہ چند ہی برس بعد اقبال کی اردو شاعری کا چوتھا دور شروع ہوا۔ بانگ درا کو چھوڑ کر باقی ماندہ شاعری اسی دور کی دین ہے۔

علامہ اقبال کی اردو شاعری کا چوتھا دور دراصل بانگ درا کی اشاعت کے بعد شروع ہوا۔ بانگ درا کی بے پناہ مقبولیت بھی اقبال کو پھر سے اردو شاعری کی طرف مایل کرنے کی ایک وجہ ہے۔ اس دور میں شاعر اقبال سے زیادہ فلسفی اقبال کھل کر سامنے آئے ہیں جو کہ مکمل طور پر فلسفہ خودی میں سرشار و بے خود ہیں۔

۱.....

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صحگا ہی
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی

۲.....

خودی میں گم ہے خدائی تلاش کر غافل

یہی ہے تیرے لئے اب صلاح کار کی راہ

اس دور کے کلام میں اقبال نے فلسفہ خودی کے تمام اجزا اور اسرار و رموز کو واضح اور مکمل طور پر ابھارا اور بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس دور میں انہوں نے مغربی تہذیب و تمدن کی کافر

سامانیوں اور خرایوں، سیاسی موضوعات، اشتراکیت اور دوسرے کئی موضوعات کو مختلف اصنافِ سخن میں بیان کرتے ہوئے جوشِ بیان کو مکمل کی حد تک پہنچایا ہے۔ اس دور میں ”پیامِ مشرق“، ”زبورِ عجم“، ”جاوید نامہ“ اور ”بالِ جبریل“، جیسی گراں قدر تخلیقات تصنیف ہوئیں۔ اس کے علاوہ اُن کی نیم واعظانہ اور نیم شاعرانہ کتاب ”ضربِ کلیم“ شائع ہوئی۔ ان سمجھی تخلیقات کا مطالعہ کرنے کے بعد علامہ اقبال کے شاعرانہ زورِ بیان، جوشِ کلام، بزستگی اور روانی پر دلِ عش عش کرتا ہے۔ اس ضمن میں ایک اہم بات یہ ہے کہ اس دور کی تخلیقات میں ”ارمنگانِ حجاز“ جو کہ نومبر ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی، میں زورِ بیان اور جوشِ کلام سے زیادہ سوز و گداز پایا جاتا ہے۔ ایسا اس لئے کہ اُس وقت علامہ اپنی عدالت کے سبب پریشانِ حال تھے۔ حالانکہ زورِ بیان اور جوشِ کلام کی کمی صرف فارسی کلام میں ہے جبکہ اردو نظموں میں وہی جوش اور ولہ موجود ہے جو کہ علامہ کے اشعار کا خاصہ ہے۔

اس دور میں اقبال کشمیر کے حالات سے کافی متاثر رہے ہیں اور انہوں نے ”ارمنگانِ حجاز“ کی کئی نظموں میں کشمیر اور کشمیریوں کو خطاب کرتے ہوئے کبھی یہاں کے لوگوں کی بنبی پر افسوس کیا اور کبھی انہیں ولہ اور جوش سے سرفراز کیا ہے۔

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر

کل جسے اہلِ نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر

”یا“

جس خاک کے ضمیر میں ہوا آتشِ چنار
ممکن نہیں کہ سرد ہو وہ خاکِ ارجمند

اُنہوں نے کشمیری قوم وطن کے خلاف غاصب اور بیرونی حکمرانوں کی ریشہ دوائیوں
اور ظلم و جبر کے خلاف آواز اٹھائی ہے اور اپنے اشعار میں کفِ افسوس ملا ہے۔

بادِ صبا اگر نہ جینوا گزر کنی
حرفے زماں مجلس اقوام باز گوئے
دہقاں و کشت و کوه و بیالاں فروختند
تو مے فروختند و چہ ارزال فروختند

شاعری کے اس دور کے اختتام پر علامہ اقبال کافی علیل ہو گئے تھے اور جا بجا جسمانی
بیماریوں نے اُنہیں آگھیرا تھا لیکن کہا جاتا ہے کہ جب جسم کمزور ہو جاتا ہے تو روح قوی ہو جاتی
ہے اور جب روح قوی ہو جائے تو جذبات و احساسات، ولوہ اور جوش، تجربے کی بھٹی میں تپ کر
کندن بن جاتے ہیں۔ یہی کچھ علامہ اقبال کے ساتھ بھی ہوا۔ شاعری کے اس دور کی آخری
تخلیقات کے مطالعے سے یہ بات صاف عیاں ہو جاتی ہے کہ ان کی شاعری پُختہ ہو گئی ہے اور ان کا
انداز و اعظامانہ اور ناصحانہ ہو گیا ہے۔

تیرے دریا میں طوفان کیوں نہیں ہے
خودی تیری مسلمان کیوں نہیں ہے
عبد ہے شکوہ تقدیرِ یزاداں
تو خود تقدیرِ یزاداں کیوں نہیں ہے

الغرض بے آرامی، جسمانی کلفتوں اور پریشان حالی سے پُرد اسی دور نے اُنہیں اقبال
سے اقبالِ کامل بنادیا۔

اقبّال کے شعری اصناف:-

اقبّال کے کلام کا اگر مجموعی طور سے جائیزہ لیا جائے تو انہوں نے لگ بھگ ہر صفتِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے مگر غزل، مرثیہ، مشتوی، مناظر قدرت، رباعیات، طنز یہ وظیر یقانہ اور قومی و وطنی نظموں میں جس طرح سے انہوں نے اپنے خیالات سے شاعری کے چمن کی آبیاری کی ہے، وہ نہ صرف شاعری کے ذخیرے میں ایک گراں قدر اضافہ ہے بلکہ اگر اسے شاعری کی آبرو کہیں تو بے جانہ ہو گا۔

اقبّال کی غزل گوئی:-

چونکہ اقبّال نے اپنی شاعری کے ابتداء میں داغ سے اپنے کلام کی صحیح لی تھی اس لئے ان کی ابتدائی غزوں میں داغ کے کلام کی سی شوئی، روانی اور برجستگی پائی جاتی ہے لیکن چونکہ یہ رنگ اُن کی سبجدیدہ طبیعت سے میل نہیں کھاتا تھا اس لئے انہوں نے اسے بہت جلد ترک کر دیا اور اپنی افتاب طبیعت کے بعینہ، مثل غالب کا رنگ اختیار کر لیا۔ تنقید زگاروں کا یہ ماننا ہے کہ اقبّال کی غزوں میں غالب کے کلام سے متاثر ہیں۔ پروفیسر عبدالقدوس رور کے مطابق:

”اقبّال نے ارشد سے صوری تلمذ حاصل کیا، داغ سے تحریری اصلاح لی، مگر

غالب سے معنوی استفادہ کیا“۔^۱

یوں بھی کہا جاتا ہے کہ داغ نے اقبّال کی غزل میں زبان و بیان کا حسن جگایا اور غالب نے اقبّال کو فلسفیانہ فکر و نظر کا احساس دیا۔ جبکہ بعض لوگوں کا ایک الگ اور دلچسپ خیال یہ ہے کہ فارسی میں مختلف اقلیم سخن کی فرمائز وائی کرنے والے تین شاعر فرد وہی (ابیات)، انوری

۱۔ غلام دیگیر شید، آثارِ اقبّال، (ادارہ اشاعت حیدر آباد کن، ۱۹۷۳ء)، ص۔ ۱۲۲۔

(قصیدہ) اور سعدی (غزل) گزرے ہیں۔ جبکہ اس کے مقابلے میں اردو میں میر اور غالب صرف دو ہی مسلم الشبوت اُستاد تھے۔ اس لئے خدا نے ان دونوں کو اقبال کی ذات میں جمع کر کے ایک تیسرا شاعر پیدا کر دیا اور اردو کی اس کمی کو پورا کر کے اسے فارسی اور ایران کی صفوں میں لاکھڑا کر دیا۔ اُن کی غزل میں جگہ جگہ میر و غالب کا اثر اور اُن کا رنگ جھلکتا نظر آتا ہے جو کہ اُن کی ترکیبیوں سے آ راستہ ہے۔ اقبال کا رنگِ غزل انہی دو مسلم الشبوت اُستادوں کی روشن پر قائم ہے۔ اقبال کی بعض غزلوں میں میر و غالب کا اثر اس قدر نمایاں دکھائی دیتا ہے کہ بعض اوقات گماں ہوتا ہے کہ خیال اُن ہی کا ہے مگر اقبال کی زبان سے ادا ہوا ہے۔

کہوں کیا آرزوئے بیدلی مجھ کو کھاشک ہے
مرے بازار کی رونق ہی سودائے زیاد تک ہے
سکونِ دل سے سامانِ کشود کار پیدا کر
کہ عقدہ خاطر گرداب کا آبِ رواں تک ہے

”یا“

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدہ دل وا کرے کوئی
عذر آفریں جرم محبت ہے حسنِ دوست
محشر میں عذر تازہ نہ پیدا کرے کوئی

”سکونِ دل“، ”کشود کار“ اور ”عقدہ خاطر گرداب“ غالب کی ترکیبیں ہیں۔ اقبال کا یہ شعر غالب کا خاص انداز سمائے ہوئے ہے۔

میں انتہاے عشق ہوں تو انتہاے حُسن

دیکھے مجھے کہ تُجھ کو تماشا کرے کوئی

درج ذیل اشعار میں میر کارنگ نمایاں طور پر موجود ہے

کوئی دم کا مہمان ہوں اے اہلِ محفل

چراغِ سحر ہوں بُجھا چاہتا ہوں

نہیں بیگانگی اچھی رفیق راہِ منزل سے

مُہہر جاے شر رہم بھی تو آخر چلنے والے ہیں

مانا کہ تیری دید کے قابل نہیں ہوں میں

تو میرا شوق دیکھ مرا انتظار دیکھ

اقبال کے پہلے دور کی شاعری میں میر و غالب کا اثر اگرچہ زیادہ نمایاں ہے مگر ان کے دوسراے دور کی شاعری جو کہ یورپ کی راحتوں اور زنگینیوں میں پروان چڑھی، مگر یہ مسٹی اور زنگینی ان کی غزاں پر اثر انداز نہ ہو سکی اور میر و غالب کی روشن برقراری مندرجہ ذیل اشعار میر کے لمحے میں ہیں ۔

پاگئی آسودگی کوئے محبت میں وہ خاک

مُدت توں آوارہ جو حکمت کے صحراؤں میں تھی

بھلی ہے ہم نفس اس چمن میں خاموشی
کہ خوشنواوں کو پابندِ دام کرتے ہیں

نہ پوچھا قبائل کاٹھ کانا بھی وہی کیفیت ہے اس کی
کہیں سر را گزر بیٹھا ستم کش انتظار ہوگا
غالب کا انداز مندرجہ ذیل اشعار سے پتہ چلتا ہے۔

خصوصیت نہیں کچھ اس میں اے کلیم تری
شجر و حجر بھی خدا سے کلام کرتے ہیں

چمک تیری عیاں بھلی میں آتش میں شرارے میں
جھلک تیری ہویدا چاند میں سورج میں تارے میں
یہاں اس بات کا ذکر کرنا مناسب ہے کہ یورپ میں رہ کر اقبال کے وطنی اور سیاسی خیالات
میں بے حد تبدیلی واقع ہوئی جو کہ ان کے اُس دور اور آنے والے دور کی غزلوں میں نمایاں ہے۔
کہیں پرتو یہ اثر اس قدر حاوی ہے کہ ان کی بعض غزلیں مکمل طور پر سیاسی رنگ میں رنگ گئیں ہیں۔
اقبال نے اپنے پہلے دو ادوار کی کئی غزلوں میں میر و غالب کے مضامین استعمال کئے
ہیں مگر اقبال کے اندر کا حقیقی جذبہ ان کو ایک ایسا آہنگ عطا کرتا ہے کہ ان مضامین میں نیا پن
جھلکتا ہے اور کسی بھی طور یہ مضامین نقل شدہ نہیں لگتے بلکہ ان کے اندر جو ہنگامہ خیزی اور ولہ

انگیزی بھری ہوتی ہے اُس سے ان استعمال شدہ مضامین کی زینت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ اقبال کے تیسرے دور کی غزلیں جوش اور اصیلیت، رعنائی، بُرستگی اور شاگفتگی سے بھر پور ہیں:

پھر بادِ بہار آئی اقبال غزل خواں ہو
غنجپے ہے اگر گل ہو گل ہے تو گلستان ہو

پردہ چہرے سے اٹھا انجمن آرائی کر
چشمِ مہرو مہ و انجم کو تماشائی کر
توجہ بھلی ہے تو یہ چشمک پہاں کب تک

بے چابانہ مرے دل سے شناسائی کر

اس دور کی غزلوں میں اقبال نے اپنے مکمل فلسفہ حیات، فلسفہ عمل اور فلسفہ خودی کو لوگوں تک پہنچایا ہے۔

اقبال کے چوتھے دور کی غزلیں باقی ادوار کی غزلوں سے مختلف ہیں۔ ان غزلوں کا تعلق صوفیانہ قسم کی شاعری سے جوڑا جاسکتا ہے۔ عقل و عشق کی آمیزش اور ان کے درمیان معرکہ آرائی ان غزلوں میں اقبال کا مضمون اور شاعری کا اہم جز ہے۔ یہ غزلیں نہ تو اپنے اندر لطیف و نازک مضامین کے آگئینے رکھتی ہیں اور نہ ہی غزل کی زبان کی طرح یہ زم و لطیف، شیریں، خوشگوار اور لوچدار ہیں بلکہ اگر زبان اور مضمون کو غزل کی اساس سمجھا جائے تو یہ غزل کہلانے کی بھی مستحق نہیں ہو سکتیں۔ تنقیدنگاروں کے مطابق ان غزلوں میں تغزل کی کمی ہے۔ مگر یہ غزلیں عشق و محبت اور فلسفہ خودی کی ترجمانی کا حق ادا کرتی ہیں۔ اس قسم کی غزلیں بال جبریل میں ملتی ہیں۔ اقبال کو

اس بات کا بخوبی احساس ہے اسی لئے وہ خود اعتراف کرتے ہوئے معذرت خواہ ہیں۔

—

میری نوا میں نہیں ہے ادا نے محبوی
کہ بانگِ صورِ اسرائیل دلنواز نہیں
ایک اور جگہ فرماتے ہیں —

حدیثِ بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھ کو
نہ کر خاراشگا فوں سے تقاضا شیشہ سازی کا
جہاں تک علامہ اقبال کی فارسی غزلوں کا سوال ہے تو ان کے بارے میں یہ بات واضح
ہے کہ تغزل میں بے مثال یہ غزلیں، الفاظ کی شیرینی اور نرمی، مضامین میں سوز و گداز سمیت سبھی
خصوصیات کی حامل ہیں، جو کہ غزلیت کی شیشہ سازی کے متراود ہے۔

—

چہ شوداًگر خرامی بسرائے کار دانے
کہ متاعِ نارِ دائمیش دلکی است پارہ پارہ
بامید آن کہ روز بے بشکار خواہی آمد
زمکند شهر یاران رم آہوانہ دارم
من بندہ بے قیدم شاید کہ گریزم یا ز
ایں طرہ پہچان را اور گردنم آؤیزی
حضرت جلوہ آن ماہ تمامے دارم
دست بر سینہ نظر برلب بامے دارم

اقبّال کی فارسی شاعری کی غزلوں میں ایک طرف خواجہ حافظ کی سرمستیاں اور جوش بیان پایا جاتا ہے تو دوسری طرف ان کے اندر عاشقانہ اور رندانہ مضامین کی آمیزش بھی ہے۔ انہوں نے اپنے فلسفہ خودی کو اپنے تمام اجزاً اولوازماں کے ساتھ پیش کیا ہے۔

اقبّال کی غزل کے محاسن:-

علامہ اقبال کی غزلوں میں لفظ و معنی کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ ان کی غزل شاعرانہ رمزیت کی اعلیٰ مثال ہے۔ ان کے رمز اور کنایہ عام نہیں ہوتے بلکہ ان کے پس پرده الفاظ کے اصلی جوہ اور معنی کی دُنیا پہاں ہوتی ہے۔ معنی کے ساتھ ساتھ شعر کے ظاہری حُسن کو قائم رکھنا ان کا طرہ امتیاز ہے۔ ان کی غزل میں دراصل غزل اور نظم کی آمیزش ہے۔ انہوں نے غزل کو نظم کے تسلسل سے سنوارا ہے جبکہ بدلتے میں انہوں نے نظموں کو غزل کا حُسن بخشتا ہے۔ ان کی بعض غزلوں میں اس قدر تسلسل بیان ہے کہ ان پر نظم کا گماں ہونے لگتا ہے۔ اسی طرح ان کی نظموں کو غزل کے حُسن سے چار چاند لگ گئے ہیں مگر دونوں صورتوں میں غزل اور نظم اپنی ہیئت اور ساخت نہیں کھوئی۔

حسن، بیان، غنائیت، موسیقیت، رمزیت، نرمی، گداختگی اور تاثیر کی شدت ان کی غزلوں کے جمالیاتی حُسن اور کیفیت کو نکھارتے ہیں اور یہی خوبیاں اقبال کی غزل کو ممتاز کرتی ہیں اور فن کا اعلیٰ نمونہ بناتی ہیں۔

اقبّال کی غزلوں میں معنی اور مفہوم اولین حیثیت کے حامل ہیں جبکہ زبان و بیان کا حُسن ثانوی درجہ رکھتا ہے۔ وہ معنی کو لفظوں کے حسین تانوں بانوں میں بُن کر لفظ، معنی، بیان اور موضوع کو بالکل عطا کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر یوسف حسین خان

یوں رقمطراز ہیں:

”کہیں بھی زبان کا ضرورت سے زیادہ غیر فطری بناؤ سنگا نہیں، نہ ہیئت پرستی ہے نہ صناعی اور کاری گری نہ لفظی بازی گری، موضوع کی مناسبت سے جو پیرایہ بیان اختیار کیا ہے وہ فنا رانہ اور غیر شعوری طور پر جمالیاتی ہے۔ اس لئے تاثیر اور کیفیت رکھتا ہے۔ اس سے معنی کی پرتیں ہمارے سامنے خود بخود کھلنے لگتی ہیں۔“^۱

اقبال کی غزل اپنے سفر کی رہ گزر میں کئی چو لے بدلتی ہے۔ یہ کئی پردوں میں مستور ہو کر جب اپنی جلوہ تابانیاں دکھاتی ہے تو صناع کاری کے حسین نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ابتداء میں یہ محض خارجی کیفیات کو سمیٹتی ہے پھر خود شناسی کے احساس کو آشکارا کرتی ہے اور آخر پر محدودیت کے چو لے کو اُتار کر اپنے اندر اتنی وسعت پیدا کرتی ہے کہ آفاقیت کا تصور لے کر کمالِ فن پر جست لگاتی ہے۔

اقبال کی غزل روایتی شاعری کے سبھی موضوعات سے انحراف کر کے، عشق، عاشقی اور تصوف میں تنوع پیدا کر کے آفاقیت پیدا کرتی ہے۔ پروفیسر حمید احمد خان اپنے مقالے میں فرماتے ہیں:

”اقبال نے بطور ایک فنکار کے شعر کی سب سے پہلی خدمت یہ انجام دی کہ غزل کی ہیئت کو ایک ایسے مضمون سے ترکیب دی جسے غزل نے اس سے پہلے اپنی ہزار سالہ تاریخ میں کبھی قبول نہیں کیا تھا۔“^۲

ڈاکٹر شیمہ رضوی اپنے ایک مضمون ”اقبال کا نظام غزل گوئی“ میں یوں رقمطراز ہیں

۱ ڈاکٹر یوسف حسین خان، روحِ اقبال (صدی ایڈیشن)، ص۔ ۱۱۸۔

۲ پروفیسر حمید احمد خان، اقبال کی شخصیت اور شاعری، ص۔ ۱۲۸۔

”جہاں تک غزل کے کلائیکی نظام کا سوال ہے، غزل ایک مخصوص علامتی نظام ہے۔ اس کی ایک مخصوص فضائے۔ اقبال نے یہاں اجتہاد سے کام لیا ہے۔ ”بال جبریل“ کی غزلیں اپنے طرز کی واحد غزلیں ہیں جو غزل کی پوری فکری روایت سے انحراف کرتی ہیں۔ اقبال نے غزل کے مخصوص علامتی نظام سے بغاوت کی ہے۔ دراصل روایتی اصطلاحات و اسالیب غزل کے فریم میں ان کے فکر و فلسفہ کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے مقصد کی وضاحت کے لئے کچھ ایسی علامتیں وضع کیں جس نے غزل کو ایک مخصوص فلسفہ زندگی اور نئے اندازِ فکر سے آشنا کیا۔ اقبال کی وضع کردہ ان علامتوں مثلاً خودی، عقل و خرد، عشق و جنوں، سوز و ساز، فراق و وصال، جلال و جمال، مرد مون و انسانِ کامل، قلندر، مردِ حُر، فقرو شاہین، قرار و تسلیم، لذتِ طلب، حرکت و تربّیت، لالہ و روشی و جگنو وغیرہ میں فلسفہ حیات کی مختلف تاویلیں اور تعبیریں پائی جاتی ہیں۔ غزل کا یہ اندازوہ انداز ہے جس کے وہی موجود بھی ہیں اور وہی خاتم بھی، کیونکہ ان علامات کو انہوں نے جس مفہوم میں ادا کیا، نہ تو انہیں ان سے پہلے کسی نے استعمال کیا، ان کے بعد کوئی اس کا متحمل ہو سکا۔^۱

اقبال کی نظم گوئی اور فنی اعتبار سے ان کی نظم کی خوبیاں:-

اقبال نے نظم کے معاملے میں حائلی اور آزاد کی روایت سے انحراف کیا۔ وہ اس صنف میں یورپی نظم سے متاثر ہیں۔ ان کے انگریزی نظموں کے ترجموں کو اگر صحیح معنوں میں پرکھا جائے تو سچ مج ترجمہ کی حق ادا نیکی کہلانے کی مستحق ہیں کیونکہ انہوں نے ترجمے کے

^۱ پروفیسر عبدالحق، اقبال کی شعری و فکری جہات، (شعبہ اردو، بلی یونیورسٹی، اشاعت اول ۱۹۹۸ء)، صص۔ ۲۲۹۔ ۲۳۰۔

ذریعے دوسری زبان کی نظم کی روح کو اردو میں منتقل کیا ہے۔

اُن کا مغربی نظموں کا گہرا مطالعہ اور ترجمہ کاری اُنہیں یہ فائدہ دے گیا کہ جب اُنہوں نے اپنے طور اس صنف میں طبع آزمائی کی تو اُنہیں اپنی نظموں کی داخلی ترتیب اور خارجی تشکیل میں بے حد مدملی۔ اُن کی نظموں کی ساخت، سانیٰ تشکیل اور ارتقائے خیال سے یہ عنديہ ملتا ہے کہ وہ نظم کو ایک کلی وحدت خیال کرتے ہیں۔ اُن کی نظموں میں غزل کا حسن اور کسی نہ کسی انداز میں تناخاطب کا فرماء ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم اپنی کتاب ”فکرِ اقبال“ میں لکھتے ہیں:

”اقبال کی ۱۹۰۵ء تک کی نظموں میں انگریزی شاعری کا اثر غالب ہے۔“

کئی نظموں میں انگریزی نظموں کا آغاز اور دلکش ترجمہ ہیں۔ کئی نظموں میں ایسی ہیں جو ترجمہ تو

نہیں لیکن انداز، تاثر و تفکر اور اسلوب بیان انگریزی ہیں۔^۱

اقبال اگرچہ نظم کی ہیئتی اعتبار سے حالی سے منحرف ہیں مگر دوسرے لفظوں میں موضوعی اعتبار سے وہ اُن کی تقلید بھی کرتے ہیں۔ اسلامی نظریہ حیات کے تحت اخلاقی تعلیم دونوں شعراء کا مرکزی تصور ہی ہے۔ لیکن اس کے علاوہ علامہ نے اپنی نظموں میں مغربی تہذیب کے منفی پہلوؤں کی ملامت کرتے ہوئے انسان کو خودشناسی کا درس دیا ہے۔ اُنہوں نے اپنی نظم کے لئے قدامت اور جدیدیت کے امتزاج سے ایک نئی راہ تعین کی ہے۔ وہ تلمیحات اور تراکیب کو ایک نئے انداز میں ڈھال کر انہیں نئے مفاهیم کی شکل میں پیش کرنے کا فن بخوبی جانتے ہیں۔

اقبال کی نظموں کا سفر مناظرِ فطرت کی عکاسی اور وطن پرستی کے جذبوں کے ارتقائی منازل طے کرتا ہوا اُن کے ہر دل عزیز موضوع یعنی فلسفہ خودی اور بے خودی کے نقطہ عروج پر

^۱ خلیفہ عبدالحکیم، فکرِ اقبال، (ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۲۰۰۲ء، ایڈیشن ۲۰۰۴ء)، ص ۲۶۔

پہنچتا ہے۔ اس سفر کے دوران وہ اپنی وسعتِ قلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے رام چندر جی، گوم، ناک، سوامی تیرتھ رام، گائیتری منتر اور اس جیسے کئی موضوعات پر دلنشیں منظوم خاکے لکھتے ہیں۔ اس سفر کے دوران ان کی کئی نظموں جیسے کہ ”پرندے کی فریاد“، ”پرندہ اور جگنو“، ”ہمدردی“، ”ماں کا خواب“، ”ایک مکڑا اور لکھی“، ”ایک گائے اور بکری“، ”بچے کی دعا“، ”ایک پہاڑ اور گلہری“، ”گورستان شاہی“، پرانگریزی تفکر، ساخت اور اسلوب کی چھاپ نظر آتی ہے۔

اقبال دونوں طرح کی یعنی طویل اور مختصر نظموں کے خالق ہیں۔ طویل نظموں میں ”مسجد قرطبه“، ”شکوہ جواب شکوہ“، ”طلوع اسلام“، ”حضر راہ“، ”ذوق و شوق“ اور ”ساقی نامہ“ وغیرہ فہم و ادراک کی خوبیوں سے لبریز ہیں۔ ان کی بعض نظمیں اپنے زمانے کی تاریخ اور حالات کی تفسیر ہیں۔ یہ نظمیں ماضی کی تصویر اور مستقبل کی آرزو ہیں۔

اگر ہم علامہ اقبال کی نظموں کے فنی محاسن کے بارے میں بات کریں تو تین چیزیں سامنے آتی ہیں۔ پہلی یہ کہ وہ مہمل چیزوں میں روح پھونکتے تھے، دوسری ان کی پیکر تراشی اور تیسرا ان کی نظموں کی غناستیت اور ترنم۔ دوسرے لفظوں میں اس طرح سے کہا جاتا ہے کہ اقبال ایک بے جان پیکر میں جذبات و احساسات کی حرارت اور علامت، تشییہ اور استعارہ کے مادوں کی روح پھونک کر اُسے ترنم میں غناستیت پر مجبور کر دیتے تھے۔

مناظر قدرت:-

اقبال نے قدرت کی صناعی اور دلفریب مناظر کو بیان کرنے کے لئے جو نظمیں لکھی ہیں ان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ان نظاروں کی ایسی مسحور گُن تصویر کھینچتے ہیں کہ نہ صرف ہمارے جذبات متاثر ہوتے ہیں بلکہ ولوہ و مسٹی اور انبساط و مسرت کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور شرطیہ

اُس جگہ یا منظر سے انسیت اور مانوسیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اقبال نے اپنی نظموں میں کئی موقعوں پر مناظر قدرت کی صناع کاریاں بیان کرتے وقت اپنے فلسفہ خودی کی بھی تبلیغ کی ہے۔ اُن کی نظم ”کوہ ہمالہ“ مناظر قدرت کی منظر کشی کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔ اس نظم کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

وہ خموشی شام کی جس پر تکلم ہو فدا
 وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھا یا ہوا
 کانپتا پھرتا ہے کیارنگ شفق کھسار پر
 خوشمنا لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر
 اُن کی ”ابر“ پر لکھی ہوئی نظم میں کمال کی حد تک جوش اور مستی بھری ہوئی ہے۔
 اُٹھی پھر آج وہ پورب سے کالی کالی گھٹا
 سیاہ پوش ہوا پھر پھاڑ سرمن کا
 نہاں ہوا جو رُخِ مہر زیرِ دامنِ ابر
 ہوائے سرد بھی آئی سوار قوسِ ابر

اقبال نے فارسی زبان میں مناظر قدرت کو بیان کرنے میں اپنی شاعرانہ قدرت کو بہترین طریقے سے استعمال کیا ہے۔ کشمیر کے دلفریب مناظر، یہاں کی خوشگوار آب و ہوا اور قدرت کی دیگر حسین کاریوں کو بیان کرنے کے سلسلے میں نشاط باغ کشمیر میں اُن کا لکھا ہوا بہاریہ ”ساتی نامہ“ اپنی مثال آپ ہے۔ اس کے علاوہ ایران کے جدید شعراء کے انداز میں اُن کی لکھی ہوئی بہاریہ نظمیں حد درجہ دل کو چھولتی ہیں۔ حالانکہ مناظر قدرت کے بیان میں انہوں نے بھی اپنے قدماً

کی تقلید کرتے ہوئے تخيّل سے کام لیا ہے لیکن بھاریہ مضمایں میں انہوں نے نہ صرف محاکات سے کام لیا ہے بلکہ ان میں تنم اور موسیقیت پیدا کر کے حد درجہ دلاؤیزی پیدا کر دی ہے۔
قومی اور وطنی نظمیں:-

اقبال نے اپنی ابتدائی نظموں میں مولانا حافظ کے طرز کی تقلید کرتے ہوئے اپنی قومی اور وطنی نظموں میں ملک و قوم کے زوال اور ان کے لٹٹے پیٹنے کی داستان سنائی ہے لیکن پھر انہیں اس بات کا احساس ہوا کہ اس طرح کی داستانِ حال سنانے سے خود اری پر سخت چوت پڑتی ہے۔ اس لئے انہوں نے اپنی نئی نظموں کی بُنیاد فخر و دعویٰ پر رکھی اور بند خیالی کو نظموں کی روح بنا کر دلؤں کے اندر جوش و ولہ پیدا کیا۔

اقبال کی قومی اور وطنی نظموں کے مندرجہ ذیل بندہ رخص و عام کی زبان پر ہیں:

—

سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا
ہم بُلبلیں ہیں اس کی یہ گلستان ہمارا

پربت وہ سب سے او نچا ہمسایہ آسمان کا
وہ سنتری ہمارا وہ پاسبان ہمارا

گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جس کے دم سے رشکِ جناب ہمارا
.....☆☆☆.....

چین و عرب ہندوستان ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے ہندوستان ہمارا

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آسان نہیں مٹانا نام و نشان ہمارا

۔

یونانیوں کو جس نے حیران کر دیا تھا
سارے جہاں کو جس نے علم و ہنر دیا تھا
مٹی کو جس کی حق نے زر کا اثر دیا تھا
ترکوں کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا تھا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

اقبال کی قومی وطنی نظمیوں کی مثال عمرو بن کلثوم کے اُس فخر یہ قصیدے سے دی جاسکتی ہے کہ
جس کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ قصیدہ اس قدر پُر جوش تھا کہ اس کے اشعار کی بدولت کئی سو برس
تک اس کے قبیلے کے لوگوں میں شجاعت و بہادری کے اوصاف قائم رہے۔ ٹھیک اسی طرح اقبال کی
قومی وطنی نظمیں تب سے لے کر آج تک قوموں کا لہو گرماتی ہیں اور رگوں میں حرارت دوڑاتی ہیں۔
فارسی کے کلام میں اقبال نے کوئی بھی وطنی اور قومی نظم نہیں لکھی۔ اس کے عکس اس
زبان میں اُن کی نظمیں، فلسفہ، شعر اور سیاست کے اسرار و موز بیان کرتی ہیں۔

قطعات یا رباعیات:-

غزل کا اپنا ایک الگ موضوع ہے جو کہ عشق و محبت کے گرد گھومتا ہے۔ شعراء نے
زمانہ قدیم سے ہی غزل کے تقدس کو قائم رکھنے کے لئے اور ساتھ ہی ساتھ دیگر مضامیں
بیان کرنے کے لئے رباعی و قطعات ایجاد کئے۔ اقبال نے بھی اپنے خیالات کے تنوع اور

وسعت کو بیان کرنے کے لئے اردو و فارسی میں کثرت سے دو شعری قطعات لکھے۔ انہوں نے قطعات کی شروعات فارسی شاعری سے کی۔ یہ قطعات پیامِ مشرق میں شائع ہوئے۔ پھر انہوں نے اپنی شاعری کے آخری دور میں کثرت سے قطعات لکھے جو کہ ارمغان حجاز اور بالِ جبریل کی زینت بنے۔ قطعات علامہ اقبال کی شاعری کا ایک اہم جزو تصور کئے جاتے ہیں ان کے ذریعے انہوں نے اپنے فلسفیانہ اور صوفیانہ خیالات کو ادا کیا ہے۔ یہ قطعہ عام طور پر دو دو شعر کے ہیں جو کہ صورۂ رُباعی کی طرح نہیں اس لئے ہم ان کو قطعہ نما رُباعی کہہ سکتے ہیں۔

شکایت کا لہجہ لئے ہوئے یہ قطعہ ملاحظہ ہو ۔

—
تیرے شیشے میں مئے باقی نہیں ہے
 بتا کیا تو میرا ساقی نہیں ہے
 سمندر سے ملے پیاسے کو شنبم
 بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے
 یہ قطعہ عشق کی فضیلت بیان کرتا ہے

—
تیرے سینے میں دم ہے دل نہیں ہے
 ترا دم گرمیٰ محفل نہیں ہے
 گزر جاعقل سے آگے کہ یہ نور
 چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے

فارسی زبان میں یہ قطعہ جرأت و بے با کی ظاہر کرتا ہے

۔

دل بے باک راضر غام رنگ است
دل تر سندہ را آہو پنگ است
اگر بیمے نداری بحر صحراست
اگر ترسی بہر موجش نہنگ است

مثنوی:-

اقبال نے فارسی زبان میں دو مثنویاں اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی لکھ کر اس صنف میں اپنے سفر کا آغاز کیا۔ اس کے بعد انہوں نے کئی مثنویاں تخلیق کیں جن میں ”مسافر“، ”جاوید نامہ“، ”گلشنِ رازِ جدید“، ”پس چہ باید کردارے اقوامِ مشرق“ شامل ہیں۔ اقبال کی مثنویوں کے بارے میں عام رائے یہ ہے کہ یہ مثنویاں شاعرانہ جوش اور لاطافت سے خالی ہیں۔ اُن کی مثنویاں ”رموزِ بے خودی“ اور ”پس چہ باید کردارے اقوامِ مشرق“ شاعری سے زیادہ وعظ ہیں۔ مگر ان سے ہمیں اقبال کے فلسفیانہ عقاید کے بارے میں جانکاری حاصل ہوتی ہے۔

مثنوی کی صنف اقبال کے لئے اس لئے موزوں تھی کیونکہ اُول تو اُن کی فلسفیانہ حیثیت کو سمجھنے کے لئے یہ صنف رہنمای ثابت ہوئی ہے اور دوسرا یہ کہ اقبال کے ایک شاعر ہونے کے علاوہ اُن کے مجدد، مصلح اور مبلغ ہونے کی حیثیت سے انہیں اپنے صوفیانہ، مصلحانہ اور اخلاقی مسائل سمجھانے کے لئے یہ صنف سب سے زیادہ استعمال ہوئی ہے۔

اقبال نے اس صنفِ سخن میں مولانا روم کی تقلید کرتے ہوئے زندگی سے تعلق رکھنے

والے گوناگوں مسائل کوش اور ان تمثیلات سے سمجھایا ہے۔ اُن کی مشنویوں میں اگر جدت کی بات کریں تو علامہ نے اس میں غزل کی آمیزش کر کے مشنوی کے ذائقے کو ہلکا ساتبدل کر دیا ہے جو کہ دل کو لبھانے کا سامان پیدا کرتا ہے۔

اردو زبان میں اقبال نے کوئی بھی مشنوی نہیں لکھی مگر ”ساقی نامہ“ جیسے بہاریہ میں نہایت ہی مستانہ لمحے میں ترجم اور موسیقیت کے ساتھ اپنے ولولہ انگیز اور پُر جوش فلسفہ خودی کو بیان کرنے کے لئے انہوں نے میر حسن کی مشنوی ”سحر البدیان“ کی بحث کا انتخاب کیا ہے۔ جس کے ولولہ انگیز متین، سنجیدہ اور باوقار مضمایں کی ادائیگی کے لئے مشنوی کا یہ مستانہ حصہ بے حد موزوں تھا۔

—

دامدِ رواں ہے یہم زندگی
ہر اک شے سے پیدا رم زندگی
یہ ثابت بھی ہے اور سیار بھی
عناسِر کے پھندوں سے بیزار بھی
چمک اس کی بچلی میں تارے میں ہے
یہ چاندی میں سونے میں پلے میں ہے
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی
فقط ذوق پرواز ہے زندگی
مرثیہ نگاری:-

مرثیہ درد و غم، رنج والم، سوز و گداز اور حرمان و یاس کو بہترین طریقے سے ادا کرنے کے لئے ایک موزوں صنف ہے۔ ان سچی حالتوں کا اگر اقبال کی طبیعت سے موازنہ کیا جائے تو

صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ چیزیں اقبال کی طبیعت میں موجود نہیں بلکہ اس کے برعکس ان کی طبیعت پر جوش، فلسفیانہ ہرگامہ خیز اور ولہ انگیز ہے جو کہ مرثیہ گوئی کے عین منافی ہے۔

اقبال نے چند ایک مرثیے لکھے ہیں جیسے کہ اپنی والدہ مرحومہ کی یاد میں سر راس مسعود جو ان کے قریبی دوست تھے اور داغِ دہلوی جو کہ ابتدائیں ان کے استاد رہے ہیں، کی شان میں انہوں نے اس صنفِ سخن سے طبع آزمائی کی ہے۔ ان میں سے داغِ دہلوی کا مرثیہ ہی مرثیہ گوئی کی کسوٹی پر پورا اُترتا ہے۔ اس کے علاوہ سر راس مسعود کے مرثیے کے پہلے چند اشعار بھی مرثیہ کی شان رکھتے ہیں لیکن اگر مجموعی طور پر اقبال کی مرثیہ گوئی پر بات کی جائے تو یہ کہنے میں کوئی بھی عارمحسوس نہیں ہوتا کہ اقبال کا لہجہ کبھی بھی حسرت و یاس کا محسوس نہیں ہوا، جو کہ مرثیے کا خاصہ ہے۔ اس کے برعکس ان کے لہجے میں وہی بلند آہنگی موجود ہے جو کہ ان کی نظموں کی پہچان ہے۔ داغ کے مرثیے کے چند ابتدائی اشعار ملاحظہ ہوں:

عظیمتِ غالب ہے اک مدت سے پیوند ز میں

مہدی مجروح ہے شہرِ خموشان کا مکین

توڑ ڈالی موت نے غربت میں مینائے امیر

چشمِ محفل میں ہے اب تک کیفِ صہبائے امیر

آج لیکن ہم نوا سارا چمن ماتم میں ہے

شمع روشن بُجھ گئی بزمِ سخن ماتم میں ہے

ظریفانہ شاعری:-

اقبال کا ظریفانہ کلام بہت قلیل ہے۔ اس صنفِ سخن میں انہوں نے اکبرالہ آبادی کی تقلید کی ہے۔ حالانکہ انہوں نے اپنے طور سے قافیوں اور اشعار میں جدت لانے کی کوشش کی

ہے لیکن انہیں اس صنف کا مجتہد قرار دینا کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے۔

اقبال کے ظریفانہ کلام کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

—

تھے وہ بھی دن کہ خدمتِ استاد کے عوض

دل چاہتا تھا ہدیہ دل پیش کیجئے

بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق

کہتا ہے ماسٹر سے کہ بل پیش کیجئے

—

مشرق میں اصول دین بن جاتے ہیں

مغرب میں مگر مشین بن جاتے ہیں

رہتا نہیں ایک بھی ہمارے پلے

واں ایک کے تین تین بن جاتے ہیں

کلام اقبال کی ادبی خوبیاں یا اسالیب شاعری:-

اقبال کے فنِ شاعری کے بارے میں اگر بات کی جائے تو اس بارے میں صوفی

غلام مصطفیٰ تبسم فرماتے ہیں۔

”آن کا کمال فنِ شاعری کی ظاہری رسوم و قیود سے بالاتر ہے۔ آن کے کمال کا انحصار

علوٰ تخييل پر ہے، شوئي بيان اور زور کلام پر ہے، الفاظ و تراکیب کی رنگینی اور چھستی پر ہے۔“^۱

۱۔ پروفیسر سید وقار عظیم، اقبال معاصرین کی نظر میں، (مجلس ترقی ادب کلب روڈ لاہور، طبع اول۔ دسمبر ۱۹۸۳ء)، ص۔ ۲۶۱۔

اُنہوں نے اردو شاعری میں جو نئے اسالیب تراشے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ پُرانے اسالیب کو نئے انداز سے استعمال کر کے جو نئے آہنگ پیدا کئے وہ اردو شاعری میں نہ صرف اک گراں قدر اضافہ ہیں بلکہ وہ شاعری میں اختراعات کا حکم رکھتے ہیں۔

(۱) رمزیت:-

اس میں کسی مضمون کو استعارہ، کناہ یا اور قصص و حکایت کے ذریعے بیان کرتے ہیں۔ اقبال نے یہ اسلوب دقيق قسم کے فلسفیانہ اور سیاسی مسائل کو بیان کرنے کے لئے استعمال کیا ہے۔ رمز و کناہ یہ میں اُنہوں نے بہت سے اہم فلسفیانہ مسائل کی تشریح کی ہے۔ اس کے بارے میں وہ یوں فرماتے ہیں ۔۔۔

برہمنہ حرف نگفتن کمال گویائی است

حدیث خلوتیاں جز بہ رمز و ایمانیست

(۲) رومانیت:-

شعر و ادب کے اس اسلوب میں تخيّل اور جذبات کا زور ہوتا ہے۔ یہ بات عیاں ہے کہ تخيّل اور جذبات کی پرواز لا محدود ہوتی ہے اس لئے اس قسم کی شاعری بھی غیر محدود و دوسرے کی حامل ہے۔ مشرقی ادب کا مطالعہ کرنے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ غزل کی مستقل صنف اسی قسم کی شاعری کے لئے مختص ہے۔ لیکن اقبال اس ضمن میں الگ رائے رکھتے ہیں۔ اُن کے مطابق غزل کی طرح اس قسم کی شاعری میں جھوٹ، نقلی اور فرضی جذبات کافی نہیں بلکہ اُن کے مطابق کسی فنِ لطیف میں تک تک کوئی اثر پیدا نہیں ہو سکتا جب تک کہ خود شاعر کے اندر جذبہ موجود نہ ہو۔ اتنا ہی کافی نہیں بلکہ سُننے والا بھی اسی جذبے سے مأمور ہونا چاہیے۔

اقبال کے سینے میں موجود جذبے اُن کی شاعری کا منبع ہیں جس میں اُن کی مکمل شاعری کا احاطہ ہوتا ہے۔ اُن کی شاعری کے جذبات جذب و مستی سے تعلق رکھتے ہیں جو کہ اُن کے شاعرانہ مقاصد کے لئے نہایت ہی اہم اور موزوں تھے۔ اُنہوں نے اس کے اظہار کے لئے ایک مختصر مگر معنی خیز اصطلاحی لفظ ”قلندر“ کا خطاب اپنے لئے پسند کیا۔

انگریزی ادب میں رمزیت اور رومانیت دو الگ مسلک کی حیثیت سے جانے اور سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن علامہ کا انداز ہی نرالا ہے۔ اُنہوں نے دونوں کی آمیزش سے ایک نیا ہی عالم پیدا کیا ہے۔ اس قسم کی ایک حسین آمیزش اُن کی نظم ”حور اور شاعر“ میں دیکھنے کو ملتی ہے جس میں اُنہوں نے خیر و شر کی آمیزش کے فلسفے کو ایک نئے اور خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔

نہ بہ بادہ میل داری نہ بمن نظر کشائی

عجب این کہ تو ندائی رہ ورسم آشنائی

بنوائے آفریدی چہ جہاں دل کشائی

کہ ارم بچشمت آید چو طسم سیمیائی

انگریزی ادب کی رمزیت اور علامہ اقبال کی رمزیت کا اگر موازنہ کیا جائے تو دونوں میں یہ مماثلت ہے کہ دونوں نے ڈرامے کی طرز یا شکل اختیار کی ہے جبکہ فرق یہ ہے کہ اقبال کی رمزیت تشبیہ اور استعارہ سے مرتبت ہے۔

(۳) کلاسکیت:-

اس قسم کی شاعری میں طریق فن اور ظاہری شکل کا خاص لحاظ رکھا جاتا ہے جبکہ تخیل اور جذبات کو ثانوی درجہ دیا جاتا ہے۔ انگریزی ادب میں اس مسلک کو کلاسکی کہتے ہیں۔ یہ مسلک

خصوصی طور پر واقع نگاری اور تاریخی مضامین کے لئے مختص ہے۔ اس نے اقبال نے لگ بھگ سبھی تاریخی نظموں میں اس طرز کو اپنایا ہے۔ علامہ کی کلاسکیت میں یہ خوبی ہے کہ انہوں نے اس میں بھی رومانیت کے عناصر کی آمیزش کی ہے۔ بالِ جبریل میں ”عبد الرحمن اول“ کے سرزمینِ اندرس میں پہلا کھجور کا درخت، والی نظم اس مسلک کی بہترین مثال ہے۔ اس نظم کو پڑھتے ہوئے قاری کے ذہن کے قرطاس پر اُن سب تاریخی مقامات کی شبیہہ اُبھرتی ہے جو فاتح عربوں کے ذوقِ عمل کے آئینہ دار تھے۔

اس نظم میں اقبال خلیفہ کو کھجور کے درخت سے انتہائی محبت آمیز الفاظ میں یوں مخاطب کرواتا ہے:

۔

میری آنکھوں کا نور ہے تو	میرے دل کا سرور ہے تو
اپنی وادی سے دور ہوں میں	میرے لئے نخل طور ہے تو
مغرب کی ہوانے تجھ کو پالا	صحراۓ عرب کی ہُور ہے تو
پردیس میں ناصبور ہوں میں	پردیس میں ناصبور ہے تو
غربت کی ہوا میں بارو رہو	ساقی تیرا نم سحر ہو

اس کے علاوہ علامہ کی نظم ”مسجد قرطبة“ اور ”اسرارِ خودی“ و ”رموزِ بے خودی“ کی نیم واعظانہ اور شاعرانہ حکایتیں بھی اس مسلک کی مثالوں کے طور پر شمار کی جا سکتی ہیں۔

بقول ڈاکٹر یوسف حسین خان:

”وہ خشک طریقے پر واعظ نہیں کرتے۔ واعظانہ مقدمات اُن کی شاعری میں

شاز و نادر ہیں لیکن ان کی شوخ گفتاری اخلاقی موضوعوں کو بھی ایسے لطیف اور دلکش انداز میں پیش کرتی ہے کہ سامع کے دل کو سیری نہیں ہوتی۔^۱

(۱) حُسن الفاظ:-

اگرچہ اقبال کی شاعری ہر طرح کے مضامین سے آراستہ ہے لیکن یہ دیکھا گیا ہے کہ ان کے کلام میں کہیں بھی متبدل عامیانہ اور سبک الفاظ کا گذر نہیں ہے۔ ایسا اس لئے کیونکہ ان کی طبیعت اور بلندی فطرت ایسی چیزوں کو کسی بھی طور گوارا نہیں کرتی۔ اسی لئے وہ کلام حُسن و عشق کے عظیم شہہ سوار ہو کر بھی کبھی کسی ”بیسوا“ کی زلف کے گرد گیرنہ ہو سکے۔ وہ ہمیشہ اپنے کلام میں شستہ پا کیزہ اور فصحیح الفاظ کے استعمال کا خیال رکھتے رہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے ظریفانہ کلام میں چند عامیانہ الفاظ موجود ہیں جیسے کہ ”ساقی نامہ“ کے مندرجہ ذیل شعر میں اس قسم کے الفاظ کی مثال دی جاسکتی ہے۔

گیا دور سرمایہ داری گیا تمشا دکھا کر مداری گیا

علاوه ازیں بانگِ درا کے ظریفانہ کلام میں کچھ متبدل الفاظ جیسے کہ ڈینگ، ہینگ، سینک، مٹکا، جھٹکا وغیرہ موجود ہیں۔ ان الفاظ کو ہم ظریفانہ کلام کے مزاج کو سمجھتے ہوئے ”ہلکا“ تو کہہ سکتے ہیں مگر ”عامیانہ“ نہیں کہہ سکتے، البتہ سنجیدہ کلام میں حُسن الفاظ کا خصوصی طور پر خیال رکھا گیا ہے اور اس قسم کے الفاظ قطعاً نہیں پائے جاتے۔

اقبال کے کلام میں لفظی صناعتیں بہت کم تعداد میں موجود ہیں لیکن بعض حالتوں میں انہوں نے لفظی صناعتوں کی تکرار استعمال کی ہے جو کہ موسیقیت اور حسین تاثر پیدا کرتی ہے۔ مثال کے طور پر چند

^۱ مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم، اقبال کامل، (طبع ششم، ۱۹۸۵ء)، ص۔ ۱۹۶۔

شعر ملاحظہ ہوں۔

حضر بھی بے دست و پا الیاس بھی بے دست و پا
 میرے طوفاں یم بہ دریا بہ دریا جو بہ جو
 میں کھلکھلتا ہوں دلِ یزداں میں کائنے کی طرح
 تو فقط اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو

تیرے محیط میں کہیں گوہر زندگی نہیں
 ڈھونڈ چکا میں موج موج دیکھ چکا صدف صدف
 اقبال ایک انقلابی شاعر تھے جن کی غزلیں و نظمیں دلوں کو گرماتی ہیں اور روح میں شرارے
 پیدا کرتی ہیں۔ اسی لئے انہوں نے اپنی انقلابی شاعری کو غزل ہی کی زبان میں استعاروں اور
 کناپوں سے آرائستہ و پیرائستہ کر کے پیش کیا ہے۔
 پر دہ بر گیرم دور پر دہ سخن می گویم
 مجنون گور کھپوری فرماتے ہیں:

”اگر ہم صحیح ذوق کے ساتھ اقبال کے کلام کا مطالعہ کریں تو کیا نظم میں کیا
 غزل میں جو کیفیت سب سے زیادہ نمایاں اور موثر طور پر محسوس ہوتی ہے وہ وہی ہے
 جس کو بہم اور مجموعی طور پر تغزل کہا جاتا ہے۔ ہم کو تو کبھی کبھی ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ
 اقبال فطرتاً غزل گو تھے اور اتنے بڑے نظم نگار ہونے کے بعد اور اس کے باوجود بھی وہ
 غزل گو ہی رہے۔ نظموں میں بھی انہوں نے ایک قسم کی غزل گوئی ہی کی ہے.....

جہاں تک الفاظ اور ترکیبوں کے حُسنِ انتخاب کا تعلق ہے۔ اقبال ہم کو جدید شعراءَ اردو میں سب سے زیادہ ممتاز نظر آتے ہیں۔ ان کا اسلوب بحیثیتِ مجموعی وہی ہے جس کو غزل کا روایتی اسلوب کہہ سکتے ہیں، لیکن اقبال کا اصلی اجتہاد یہ ہے کہ انہوں نے پُرانے الفاظ و فقرات اور پُرانے اسالیب و روایات کو بالکل نئے انداز سے استعمال کر کے ہماری زندگی کی نئی ضرورتوں کے لئے کام میں لائے ہیں۔^۱

(ب) لب و لہجہ:-

عظیم شعراءَ کی ایک خاصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ ایک خاص مقصد کے تحت دل میں پختہ جذبہ لئے شاعری کرتے ہیں۔ اسی طرح ہر عظیم شاعر کا اپنا ایک منتخب لہجہ ہوتا ہے۔ جیسے کہ غالبَ کا انداز عاشقانہ تھا، اکبر کا ظریفانہ، مولانا روم کا فلسفیانہ، فردوسی کا دلیرانہ، مجاز کارندانہ اور مومن کا صوفیانہ، ٹھیک اسی طرح اقبال کا بھی ایک مخصوص لہجہ ہے۔ وہ کسی بھی موضوع پر شعر کہتے ہیں تو اپنے لہجے کی چھاپ چھوڑ ہی جاتے ہیں اور اسے کوشش کے باوجود بھی چھپا نہیں سکتے۔ شعر پڑھتے ہی فوراً اپنے چل جاتا ہے کہ یہ اقبال کا کلام ہے۔

اکثر شعراءَ کسی بڑے شاعر کے خیالات سے فیضیاب ہوتے ہیں مگر اس کے باوجود ان کا اپنا مخصوص لہجہ ہمیشہ ان کے ساتھ رہتا ہے۔ اقبال کے لہجے کی اگر بات کی جائے تو بلاشبہ سب سے الگ اور نرالا ہے۔ وہ اپنے لہجے کے لحاظ سے شروع سے آخر تک اقبال ہیں۔ ان کا شیریں لہجہ کبھی آسمانی آواز ہے اور کبھی رباني نغمہ۔ جو کہ کبھی تیز و شنید اور کبھی انقلاب انگیز ہے، کبھی قلندرانہ تو کبھی درویشانہ اور کبھی دردمندانہ ہے تو کبھی ناصحانہ۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سُراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن
(قلندرانہ)

شیرازہ ہوا ملکِ مرحوم کا ابتر
اب تُو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے
(دردمندانہ)

درویشِ خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرانہ دلی نہ صفاہاں نہ سمر قند
(درویشاںہ)

اے جانِ پدر نہیں ہے ممکن
شاہیں سے تدو کی غلامی
نایاب نہیں متاعِ گفتار
صد انوری و ہزار جامی
(ناصحانہ)

۔

اُٹھو میری دُنیا کے غربیوں کو جگا دو
 کاخِ امراء کے درو دیوار ہلا دو
 (تیز و شند، انقلاب انگلیز)

(ت) حسن قافیہ و ردیف:-

اقبال کے نزدیک ہر صفت کلام کے لئے قافیہ بندی اشد ضروری ہے۔ اُن کے کلام میں قافیہ اپنی ہر خوبی اور خوبصورتی کے ساتھ بدرجہ اتم موجود ہے۔ اقبال کی شاعری میں جہاں ایک طرف مستعمل قافیہ ہیں، وہیں ایسے غیر معروف قافیوں سے بھی انہوں نے اپنے کلام کو آراستہ کیا ہے جو کہ پُر اطف اور حسین تو ہیں، ہی لیکن جدت کاری اور تازگی کی اعلیٰ مثال ہیں۔

اقبال کے یہاں جدید قافیوں کا اک خزانہ ہے جس میں رنگارنگ کے قافیے گنگنا تے ہیں۔ انہوں نے سمجھ کی صنعت کا بڑی خوبی سے استعمال کر کے اپنے کلام کو روانی، برجستگی، خوشنوائی، چاشنی اور موسیقیت عطا کی ہے۔ مثال کے لئے یہ بند ملاحظہ ہو جو کہ ”میں اور تو“ سے لیا گیا ہے۔

۔

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا
 میں ہلاکِ جادو نے سامری تو قتیل شیوہ آذری
 میں نوائے سوختہ درگلو تو پریدہ رنگِ رمیدہ بو
 میں حکایتِ غم آزو تو حدیثِ ماتمِ دلبری

علّامہ اقبال اگرچہ ردیف کو بہت زیادہ اہم خیال نہیں کرتے لیکن پھر بھی اس کا ہونا بہتر سمجھتے ہیں کیونکہ یہ کلام کو حسین بناتی ہے۔ انہوں نے ردیفوں میں جدت کو ضروری قرار دیا ہے۔ اقبال نے اپنے کلام میں دونوں ردیفوں یعنی آسان اور مشکل کا استعمال کیا ہے لیکن وہ درمیانی درجے کی ردیفیں اختیار کرنے کے حق میں ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ عام ردیفوں میں لطف نہیں رہتا۔ اُن کی استعمال کی ہوئی ردیفوں میں اُول توجہت و تازگی پائی جاتی ہے اور دوم یہ کہ مضمون کا سرشستہ بھی ہاتھ سے جانے نہیں پاتا۔ بال جبریل سے چند ردیفوں کی مثالیں ملاحظہ ہوں جو کہ درمیانی درجے کی ہیں مگر مضمون کو گرفت میں رکھے ہوئی ہیں۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں
تو شایہن ہے پرواز ہے کام تیرا
تیرے سامنے آسمان اور بھی ہیں
اگر کچھ رو ہیں انہم آسمان تیرا ہے یا میرا
مجھے فکر جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا
اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی
خطاکس کی ہے یارب لامکاں تیرا ہے یا میرا
محمد بھی تیرا جبریل بھی قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرف شیریں ترجماء تیرا ہے یا میرا
(ج) تشبیہ و استعارہ:-

اقبال کے کلام میں تشبیہات و استعارات کی کثرت ہے۔ یہ اُن کی خاصیت ہے کہ وہ شعری مضامین کو تشبیہات و استعارات کا بناؤ سنگھار کر کے انہیں ڈلہن کی طرح آراستہ کرتے

ہیں۔ اُن کے تشبیہات و استعارات اپنی موجودگی کا احساس کرتے ہوئے اپنے آس پاس اضافت، حُسن اور تازگی بکھیر دیتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ الفاظ کسی بھی دم بول پڑیں گے۔ اُن کی تشبیہات و استعارات ہمیشہ قریب الماخذ ہوتے ہیں۔ اُن کی ایک نظم "جَنُونٌ" میں تشبیہات کی پھل جھڑیاں ملاحظہ ہوں:

جَنُونٌ کی روشنی ہے کاشانہ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں
آیا ہے آسمان سے اڑ کر کوئی ستارہ
یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں
تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا
زره ہے یا نمایاں سورج کے پیر ہن میں
چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی
نکلا کبھی گہن سے آیا کبھی گہن میں
اقبال کا کلام مفرد اور مرکب دونوں قسم کی تشبیہات سے مزیں ہے۔ اگرچہ مفرد تشبیہہ میں جدت ممکن نہیں مگر پھر بھی علامہ کی مفرد تشبیہات نزالی ہیں۔ مرکب تشبیہوں کی ترکیب اس قدر اضافت بھری ہے کہ دل عشق کر اٹھتا ہے۔

جیسے ۔

برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر
اُن کی تشبیہات ہمیشہ متحرک ہوتی ہیں جس کی وجہ سے اُن کی اضافت بڑھ جاتی ہے جیسے ۔

ہائے کیا فرط طرب میں جھومتا جاتا ہے ابر
 فیل بے زنجیر کی صورت اڑا جاتا ہے ابر
 اقبال کی تشبیہات اس قدر متحرک اور جاندار ہوتی ہیں کہ یوں لگتا ہے کہ بے جان
 چیزوں میں روح سراحت کرگئی ہو۔ ان کی کئی تشبیہات اردو شاعری میں ایک گراں قدر اضافہ
 تصور کی جاتی ہیں۔

اقبال کے شعری وجدان کو جو چیز سب سے زیادہ متحرک کرتی ہے وہ ”مظہر قوت“ ہے۔
 اسی لئے انہوں نے بلبل اور قمری کے مقابلے میں شاہین کو تشبیہ کے طور پر زیادہ استعمال کیا
 ہے۔ اپنے ایک خط میں اس تشبیہ کے بارے وہ یوں قلمراز ہیں: ”شاہین کی تشبیہ مغض شاعرانہ
 تشبیہ نہیں ہے۔ اس جانور میں اسلامی فقر کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں:
 (۱) خوددار اور غیرت مند ہے، کہ اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا
 (۲) بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا
 (۳) بلند پرواز ہے
 (۴) خلوت پسند ہے
 (۵) تیز نگاہ ہے۔
 (د) تلمیحات:-

تلیح کسی طویل اور اہم قصہ طلب واقع کو مختصر الفاظ میں ادا کرنے کو کہتے ہیں۔ اپنے
 فلسفیانہ اور شاعرانہ مقاصد کو بیان کرنے کے لئے اقبال نے تلمیحات کا استعمال کیا ہے۔ انہوں

نے ان کے ذریعے عزم و استقلال، اطاعت، جفاکشی، ایثار و قربانی، جانبازی و شہادت اور انقلاب انگلیزی کا درس دیا ہے۔ اقبال کے کلام میں کثرت سے تلمیحات موجود ہیں۔ جن کے ذریعے انہوں نے انبیاء علیہ السلام، صحابہ کرام اور دیگر واقعات کو خوبصورت انداز میں پیش کر کے اہم مذہبی، سیاسی، سماجی، علمی اور تمدنی تاریخ کا خلاصہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے ”حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور نار نمرود“ یا ”حضرت اسماعیل کی قربانی“، کو جس حسین تلمیحاتی انداز میں پیش کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

۔
بے خطر گود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محو تما شالبِ بامِ ابھی

۔
یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی

(ذ) تضمینات:-

عموماً شعراء حضرات قرآن کی کوئی آیت، حدیث کا کوئی ٹکڑا یا کسی دوسرے شاعر کے کسی شعر کا ایک مصرع اپنے کلام میں شامل کر لیتے ہیں۔ اسے تضمین کہتے ہیں۔

تضمین کا انتخاب کرتے وقت یہ خیال رکھنا لازم ہے کہ جو آیت یا مصرع جو کہ بطورِ تضمین استعمال ہو رہا ہو وہ برجستہ، نادر اور مشہور ہو اور شعر کے ساتھ اس قدر گھل جائے کہ کلام کا حصہ ہو جائے۔ علامہ کے کلام میں تضمینات کی کثرت ہے۔ اُن کی تضمینات میں مندرجہ بالا سمجھی لوازمات و خصوصیات موجود ہیں۔ اُن کے کلام کی چند تضمینات ملاحظہ ہوں:

۷

آبَادُواْ تَجْهِيْزَ آيَةَ الْمَلُوكَ

سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری
(قرآن کی آیت)

۸

اے کہ شناسی خفی را ارجلی ہشیار باش

اے گرفتار ابو بکر و علی ہشیار باش

(ر) تکرار معانی:-

اس میں شاعر کے کسی مضمون کو الگ الگ پیرائے میں کئی طریقوں اور نئے شاعرانہ طرزِ ادا سے بیان کیا جاتا ہے۔ اقبال کے کلام میں کئی ایسے مضامین ہیں، مثلاً عقل و عشق، صوفی و مُلا، کافر و مومن، فقر و درویش، خودی و انانیت وغیرہ جو کہ انہوں نے کئی کئی بار مگر نئے شاعرانہ اور رنگین طریقوں سے ادا کئے ہیں۔

(ڑ) رفتہ تھیل:-

اقبال کے شعری مضامین بنی نوع انسان کے لئے عزم و استقلال، خودداری، عزتِ نفس اور بلند ہمتی کا درس دیتے ہیں۔ اردو و فارسی شاعری میں علاّمه کی سی رفتہ تھیل اور بلند مضامین کی مثال بہت کم ملتی ہے۔

(ز) مدح و ذم:-

اقبال نے اپنے کلام میں مدح و بحوج کے سلسلے میں کافی احتیاط سے کام لیا ہے۔ اُن کی شاعری کا یہ خاصہ ہے کہ اس میں کسی بھی فرد کے بارے میں مبالغہ آمیز اور غیر حقیقی اوصاف کا بیان نہیں ہے

اورناہی اس میں کسی کے لئے ذاتی عیب جوئی موجود ہے۔ انہوں نے اپنے اشعار کے ذریعے نہ تو کسی کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے اورناہی کسی کی اس قدر عیب جوئی کی کہ وہ عرش سے فرش پر آگیا۔ انہوں نے شخص یا فرد کی مدح میں اشعار نذر کرتے وقت اس بات کو مد نظر رکھا کہ واقعیت سے تجاوز نہ ہونے پائے۔

وہ شیخ سعدی کی طرح مدح کے ساتھ مددوح کو نصیحتیں بھی کرتے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنی مشتوی ”مسافر“ میں شاہ نادر اور شاہ طاہر کے تیس مدح کا یہی انداز اپنایا ہے۔

ہجوم کرتے وقت اقبال کبھی بھی اپنی سطح سے نیچے نہیں آئے اورناہی انہوں نے کبھی اپنی زبان کو آلو دہ کیا۔ ان کے کلام میں صوفی و ملا کی ہجوم ہو یا کہ مغربی تہذیب کی، اقبال نے اس ضمن میں ہجوم کی اطیف قسم یعنی طنز و ظرافت کا استعمال کیا ہے۔

(ث) روانی و بر جستگی:-

چونکہ اقبال کے شعر کہنے کے پس پر دہ ایک جذباتی تحریک کا فرمातھی اس لئے ان کی طبیعت میں بہتے دریا کی سی روانی تھی۔ ان کی آمد کو کسی ابلجتے چشمے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ وہ ایک ہی نشست میں بے شمار اشعار کہہ ڈالتے۔ خود ان کے کہنے کے مطابق آمد شعر کی مثال تحریک جنسی کی طرح ہے کہ جسے چاہنے کے باوجود بھی روکا نہیں جاسکتا۔

روانی و بر جستگی ان کے کلام کی ایک عام وصف ہے۔ انہوں نے بعض دفعہ ایک ہی شب میں تین تین سوا شعار کہے ہیں۔ اس وصف کو سمجھانے اور اس کا یقین دلانے کے لئے کسی مثال کی چند اضاف ضرورت نہیں کیونکہ علامہ کا پورا کلام اس بات کا غماز ہی نہیں بلکہ کھلے لفظوں میں دعویٰ بھی کرتا ہے۔ تاہم موقع کی نزاکت کو صحیح ہوئے یہ چند مثالیں ملاحظے کے لئے پیش ہیں:

—

دل سوز سے خالی ہے نگہ پاک نہیں ہے
پھر اس میں عجب کیا کہ تو بے باک نہیں ہے
ہے ذوقِ تجلی بھی اسی خاک میں پنهان
غافل! تو بڑا صاحبِ ادراک نہیں ہے
وہ آنکھ کہ ہے سرمہ افرنگ سے روشن
پر کار و سخن ساز ہے نمناک نہیں ہے
کیا صوفی و مُلا کو خبر میرے جنوں کی
ان کا سرِ دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے

—

گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان	ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان	قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشان	ہمسایہ جبریل امیں بندہ خاکی
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن	قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن
عموماً شعراء کے کلام میں روانگی اور برجستگی کے وقت نیم بے ہوشی یا نیم شعوری کیفیت	
طاری ہوتی ہے۔ اقبال کے بارے میں شیخ عبدالقدیر کہتے ہیں:	
”اُن پر شعر کی آمد کے وقت ایک کیفیتِ رِقت طاری ہوتی تھی اور وہ وجود کے	
عالم میں اپنے اشعار ترنم سے پڑھا کرتے تھے۔“	

اقبال کی روانی اور بخششگی کا ایک اور خاصہ یہ ہے کہ وہ تمہید و مقدمہ کے بغیر مطلب کی بات پر آ جاتے ہیں اور اگر وہ اپنی نظموں کو عنوان نہ دیں تو فاعل اور مفعول کی پہچان ممکن نہ ہو سکے گی۔ مثلاً نظم ”فرمانِ خدا فرشتوں سے“ کے پہلے شعر ”اُٹھو میری دُنیا کے غریبوں کو جگادو۔ کاخ اُمرا کے درود یوار ہلا دو“ میں اگر عنوان ہٹا دیا جائے تو نہ حکم دینے والا سمجھ میں آئے گا اور نہ پتہ چلے گا کہ حکم کس کو دیا جا رہا ہے۔



چوتھا باب☆

علّامہ اقبال اور حافظ ابراہیم (تقابلی مطالعہ اور قدِ مشترک)

ہ.....اقبال کی شخصیت

اساسِ حیات کے عناصر

علاق و قدور کا تحریک

علمی محرکات

حافظ ابراہیم کی شخصیت

تعمیر و تشکیل کے عناصر

حافظ ابراہیم اور اقبال کے درمیان

موضوعات، اسلوب، فکر و فن اور اندازِ بیان کا تقابلی جائزہ

حافظ ابراہیم اور اقبال کے درمیان قدرِ مشترک

اقبال کی شخصیت:-

بقولِ راغب احسن:

”کسی ذات کا وجود دنیا میں از خود نہیں ہو جاتا بلکہ ہر فرد بشر کی شخصیت، اس کی حیاتی

تعمیرات، تمدنی مہیجات اور تہذیبی پیداوار کے اساس پر محکم ہوتی ہے۔^۱

اقبال کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے ان کی نفسیاتی تشریح لازمی ہے۔ اس سلسلے میں ان کی شخصیت کی تعمیر میں اپنا کردار بھانے والے سبھی عناصر و اساسات کو نمایاں کرنا ضروری ہے تاکہ فہم اقبال کا راستہ صاف ہو جائے۔

(۱).....اقبال کی اساسِ حیات کے عناصر:-

اقبال کی مادی تعمیر اور روحانی ترکیب میں جن عناصر کا عمل دخل ہے وہ ہیں:

(۱) کشمیری برہمنیت (۲) ذہانت و جمالیاتی حُسن (۳) حکمت و ادبیت

(۱).....کشمیری برہمنیت:-

اقبال کے اجداد کشمیر کے سپرو برہمن تھے۔ کشمیری قوم شکل و صورت سے پُر جمال اور ذہنی طور پر ذہین و فطیین واقع ہوئی ہے جبکہ برہمن ہمیشہ سے علم و ادب کے دلدادہ، دھنی اور زبردست ذہنی و فکری صلاحیت رکھنے والے ہوتے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ کشمیری برہمن علم و فن کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ علم و ادب اور فکر انہیں ورنہ میں ملا ہے اور ان کے خلیوں میں شامل ہے۔ ان کے اندر یہ صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود تھیں۔

۱۔ پروفیسر سید وقار عظیم، اقبال معاصرین کی نظر میں: (مجلس ترقی ادب، کلب روڈ لاہور، طبع اول، دسمبر ۱۹۸۳ء)، ص۔ ۸۵۔

(۲).....ذہانت و جمالیاتی حُسن:-

اقبال کا باطن غیر معمولی قوت و استعداد سے لبریز تھا۔ ان کی دماغی ساخت اور روحانی ورثتے کی سطحِ عام سے برتری و فوقيت واضح تھی اس لئے وہ ہر حاظ سے عبوری کھلانے کے حقدار تھے۔ اس کے علاوہ ان کی طبیعت لطافت پسند اور دل حساسیت سے بھر پور مگر صاحبِ شعور تھا۔ لطافت و علویت ان کا جوہر حیات، آرٹ اور فنونِ لطیفہ سے روح کا رشته، شعر و موسیقی اور تعمیرات و نقاشی میں وہ ”دنیاۓ حُسن“ کا اور دنیاۓ حُسن میں حقیقتِ کل کا جویا ہے۔

جُستجو گل کی لئے پھرتی ہے اجزا میں مجھے

حسن بے پایاں ہے، در دل ادوار کھتا ہوں میں

(۳).....ادبیت و حکمت:-

اقبال اور ادبیت کا آپس میں اس قدر گہر اتعلق ہے کہ دونوں لازم و ملزم ہو گئے ہیں۔ وہ شعروادب کا منبع اور سرچشمہ ہیں۔ ان کی شاعری وہ حرفِ ثریں ہے جس کے بارے میں ”جزویست از پیغمبری“ کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ ان کا ادب بیک وقت انفرادیت اور اجتماعیت کا حامل ہے۔

”کیونکہ اس کی ہستی فی نفسِ ایکِ مشن، ایک نصبِ العین، ایک منزل، ایک

مقصود اور ایک آئینڈ میل کا سراپا ہے۔“

اقبال کی حکمتی و فطری صلاحیت غیر معمولی تھی۔ وہ حقیقت کا ترجمان اور قوم کا نبض شناس تھا۔ وہ کائنات کو ایک آرٹسٹ کی حیثیت سے دیکھنا، جانا اور ظاہر کرنا چاہتا تھا۔

۔ پروفیسر سید وقار عظیم، اقبال معاصرین کی نظر میں، (مجلسِ ترقی ادب کلب روڈ لاہور، طبع اول: دسمبر ۱۹۷۴ء)، صص۔ ۸۸-۸۹۔

(ب).....اقبال کے سو شل علاق و قدروں کا تجزیہ:-

انسان کی ہنی زندگی کی تمام عادات و رسومات اُس ابتدائی فرقے یا ملت سے ماخوذ ہوتی ہیں جس سے وہ وابستہ ہوتا ہے۔ اقبال کے سو شل علاق و قدروں کا علمی تجزیہ کرنے پر یہ عیاں ہوتا ہے کہ ان کو کشمیریت، پنجابیت، ہندیت، مشرقیت اور ملیت سے واپسی رہی ہے اور ہر ایک کی خصوصیات علامہ کی شخصیت میں سراحت کر گئی ہیں۔ مثال کے طور پر کشمیریت نے ان کو ملائمت، جمایت، مجالست اور موافقت جیسی خوبیوں سے سرفراز کیا ہے۔ پنجابیت نے انہیں روح، جسوس، فضائی حریت اور محیط موافق بخشنا ہے۔ ہندیت نے انہیں حب وطن سکھایا۔ اپنے وطن کے تین فرائض و حقوق سے آگاہی دلائی اور وطن کی آزادی کے لئے ان کو اپنی فکر و کاوش کو پیش خدمت رکھنے اور اپنے حکیمانہ مشورے سے اس کی مشکلات حل کرنے کا جذبہ دیا۔ مشرقیت نے انہیں مشرق و مغرب کی افقارِ فکر سے آگاہ کرایا اور انہیں اُن کی مشرقیت کا احساس دلوا کر مشرق و مغرب کی خوبیوں اور کمزوریوں سے بخوبی واقف کر دیا۔ جبکہ ملیت نے انہیں اسلام کا اوفادار، نہیں بلکہ داعی بنایا اور اپنے شیریں کلام سے حرفِ شیریں کا ترجماء بنایا۔ ملیت کے جذبے سے ہی سرشار ہو کر انہوں نے مسلمانوں کے دلوں میں ایسی زندہ تمنا جگائی جس نے اُن کی روح کو ترپایا اور قلب کو گرمایا۔ وہ بذاتِ خود اسلامی ماحول میں پروان چڑھے اور اسی رنگ میں رنگ کر انہوں نے اپنی وفاداریوں اور محبتوں کو ملت اسلامیہ کے تابع کر دیا۔ اُن کا اسلامی ملیت کا فلسفہ یہی ہے کہ اسلام ایک جامعہ و آفاقی دین ہے اور اس کو اپنانے میں ہی انسانیت کی فلاح ہے۔

(ج).....اقبال کے علمی محرکات:-

محمد اقبال کو علامہ اقبال بنانے میں جن علمی محرکات نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا ہے

وہ یوں درج ہیں:

۱.....اعلیٰ تعلیم خصوصاً مشرقی و مغربی علوم کا عمیق مطالعہ:-

اقبال اعلیٰ تعلیم سے فیضیاب ہوا۔ ان کا مشرقی و مغربی علوم کی فیضیابی بذاتِ خود مشرقی تہذیب کے گھوارے ہند اور عرب و عجم اور مغربی تہذیب کے قلب یعنی جمنی و انگلستان میں عمل میں آئی۔ وہ دونوں تہذیبوں کے نبض شناس بنے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری خیالی یا طلسی دُنیا کی اوہا مزدہ شاعری سے ہٹ کر ایک عالم و فاضل کی شاعری ہے جو کہ حقیقی معنوں میں علم و عرفان کے دریافت کردہ حفائق کی ترجمان ہے۔

۲.....ہندی و آریائی علوم:-

اقبال کے کلام و پیام کو پڑھ کر یہ تاثر ملتا ہے کہ وہ ہندو مت اور آریائی علوم کی خاصی جانبکاری رکھتے تھے۔ ہندوستانی تہذیب و فلسفہ کا عالم و ناقد ہونے کی حیثیت سے وہ اس کی خوبیوں کو سراہتے اور اس کے نقصان کے شناساتھے۔

۳.....ایرانی فلسفہ و تصوف کی تعلیم:-

اقبال کے آبا و اجداد چونکہ کشمیری تھے اور کشمیر کا ایریانی تہذیب و زبان سے اس قدر تعلق رہا ہے کہ اسے ”ایرانِ صغیر“ کہا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں پی اتیج ڈی (ڈاکٹریٹ کی ڈگری) میں ان کا مقالہ علمیہ ایرانی فلسفہ و تصوف کے متعلق تھا۔ جس پر انہیں المانی یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ کی سند عطا کی تھی۔ اس لئے علامہ کا ایرانی تعلق و مطالعہ گہرا ہوتا گیا۔

۴.....علم یونانیات:-

اقبال یونانی قوم کی حکمت و تہذیب کے ایک بہترین مبصر ہیں۔ یونانی تہذیب اپنی

بعض ضلالتوں اور غلطیوں کی وجہ سے تاریخ کے اوراق میں معدوم ہو گئی مگر دنیا کو علمی ورثے کی جو سوغات دے گئی وہ آج تک قابل فخر ہے۔ اقبال کا علم یونانیات سے متعلق جانکاری قابل ستائش ہے۔ وہ یونانی تہذیب کی حقیقت پرستی (لآف نیچر) اور اطافت پسندی و حسن جوئی (جمالیات) سے خاص طور پر متاثر ہیں۔

۵.....رومی / لاطینی علوم:-

رومیوں نے قانون اور نظم دولت کے ادارتِ علمی کا اٹاٹھ چھوڑا ہے۔ اس کے علاوہ اس قوم نے قانون بین الاقوام کی داغ بیل ڈالی ہے۔ اقبال رومی تہذن کی مخصوص میراث کا بہترین محقق و معترف ہے۔

۶.....المانی و مغربی علوم:-

راغب احسن اپنے مضمون ”اقبال پر ایک محققانہ نظر“ میں فرماتے ہیں:

”مغربی دین و اخلاق، حکمت و فلسفہ، فنون و ادب، تمدن و معاشرت اور معاشیات و سیاسیات کا اقبال سے بہتر عالم و ناقد آج شاید ہی کوئی ہو، لے۔

اس ضمن میں وہ صرف سماحت و قیاس پر ہی تکمیل نہیں کرتے بلکہ ان کے خیالات عینی مشاہدات و تجربات کا نتیجہ ہیں۔

۷.....سامیت اور اسلام:-

اقبال تہذیب اسلامیہ کا بہترین محقق ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اسلام اور اسلامی فقہ و سیاست، تہذیب و تمدن اور ادبیات کے مطالعے میں صرف کیا ہے۔ ایک

۱۔ پروفیسر سید وقار عظیم، اقبال معاصرین کی نظر میں، (مجلس ترقی ادب کلب روڈ لاہور، طبع اول: دسمبر ۱۹۳۷ء)، ص۔ ۹۸۔

ایسے دور میں جب دنیا سیاسی و عمرانی وفاق کی ڈگر پر گامزن تھی۔ اقبال نے اسلام کو اسی عمرانی و روحانی وفاقِ عالم کی صراطِ مستقیم کے طور پر پیش کیا۔

اقبال کے علمی محرکات پر تبصرہ کرتے ہوئے راغب احسن نے یوں اظہار خیال کیا ہے۔

”دنیا نے پہلی دفعہ ایک ایسی روحِ اعظم کو پیدا کیا ہے جس نے فرستہ پہنڈ مطالعے کے ذریعے ہندو عجم، عرب و یونان، روما و المان، مشرق و غرب اور جدید و قدیم کی روح تہذیب سے آگاہی حاصل کی ہے۔ جو صاحبِ بصیرت و اجتہاد ہے اور دنیا کے لئے ایک عظیم الشان پیغام کا پیغامبر ہے“۔^۱

اقبال کی شخصیت کو بہت خوبصورتی سے بیان کرتے ہوئے رفیق ذکر یا فرماتے ہیں:

”اقبال کی شخصیت ایک پہلو دار شخصیت ہے۔ ان کی بُنیادی حیثیت شاعر کی ہے تاہم انہیں فلسفی کا درجہ بھی حاصل ہے اور مذہبی مفلکر کا بھی..... اقبال با غیانہ ذہن رکھتے تھے تاکہ ایک نیامعاشرہ تعمیر کیا جاسکے۔ اقبال کی دلچسپیاں زیادہ تر تحریدی تھیں۔ وہ رزم آرائی اور انقلاب کے دلدادہ تھے۔ انہوں نے شجاعت اور تسلیم کا درس دیا۔ ان کو نسوانیِ حُسن کی بجائے قوتِ مردانہ سے دلچسپی تھی۔ وہ آتشِ نفس تھے۔ ان کے مزاج میں خوداری تھی“۔^۲

حافظ ابراہیم کی شخصیت کے عناصر

شاعر نیل حافظ ابراہیم کی شخصیت کا مکمل طور مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اس کی شخصیت کی تعمیر و تشكیل میں جن عناصر نے اپنا کردار ادا کیا وہ اس طرح سے ہیں:

۱۔ پروفیسر سید وقار عظیم، اقبال معاصرین کی نظر میں، (مجلسِ ترقی ادب، کلبِ روڈ لاہور۔ طبع اول دسمبر ۱۹۷۴ء)، ص ۹۹۔ ۱۰۰۔

۲۔ رفیق ذکر یا، اقبال شاعر اور سیاستدان، (باب اول، نجمن ترقی اردوئی دلی، سن اشاعت ۱۹۹۵ء)

۱..... مصریت:-

اگرچہ حافظ ابراہیم کی والدہ ترکی انسل تھیں مگر ان کی شخصیت پر اس کا کوئی خاص اثر نہیں پڑا۔ ان کی رگوں میں دوڑ نے والا خون چونکہ خالص مصری تھا اس لئے وہ بھی خالص مصری تھے۔ مصریت ان کے رنگ و مزاج حتیٰ کہ روح میں بھی سراحت کر گئی تھی۔

۲..... عربیت:-

حافظ ابراہیم مصری ہونے کے باوجود مصری عامیانہ بولی بولتا تھا۔ مگر وہ خالص عربی کا دلدادہ تھا۔ عربیت سے اُسے جنون کی حد تک لا گاؤ تھا۔ اس دلچسپی کی وجہ قدیم عربی ادب کا مطالعہ تھا جس کی اساس بارودی کی شاعری تھی۔ بارودی کی شاعری اُس کے شعور اور روح میں بس گئی تھی۔ اتنا ہی نہیں بارودی کی شخصیت نے انہیں نہ صرف صاحب قلم بلکہ صاحب تلوار بھی بنادیا۔ حافظ ابراہیم کو عربیت پر اس قدر ملکہ حاصل ہو گیا تھا کہ اُس نے خالص عربی اسلوب اپنا کر عربیت کے شعری آہنگ، زورِ بیان اور فصاحت و بلاغت کو ممتاز کر دیا۔

۳..... سماجی ماحول:-

دورِ حافظ ابراہیم کا مصری سماج غربت، ناداری، خرافات و بدعاں اور جہالت و پسماندگی کے درمیان ایک ایسا اسلامی طرز کا سماج تھا جس میں غیر اسلامی طرز کے رسم و رواج کا غلبہ تھا۔ مصر کے سماج پر ترکی انسل افراد کا غالبہ ہونے کی وجہ سے مصری سماج میں ترکوں کے رائج شدہ رسومات، روایات اور رواداریاں بھی نبھانی پڑتی تھیں۔ چونکہ حافظ ابراہیم کی نشوونما ایک متوسط طبقے میں ہوئی اس لئے اُس کا میل جوں اعلیٰ وادنی دونوں طرح کے لوگوں سے رہا۔ اُن کی خاصیت تھی کہ وہ عام لوگوں سے میل ملا پر رکھتے تھے اور ان کی سیاسی، سماجی، تہذیبی اور

ترقی کے مسائل میں بچپسی لیتے تھے۔ جس سے وہ عام و خواص میں یکساں مقبول ہوئے۔ ان عناصر کے علاوہ مذہبی اور وطن پرستی یا قومیت کے عناصر نے بھی ان کی شخصیت کی تشکیل میں اہم رول ادا کیا۔ حافظ ابراہیم طبیعتاً قوم پرست تھے۔ وہ مزاجاً فطرت پسند، خوش اخلاق اور سیما بی فطرت رکھتے تھے۔ بچپن سے ہی اپنی تینی اور زبوں حالی کا احساس دل میں لئے، جوانی میں غمِ دور اس اور غمِ روزگار کے ستائے ہوئے حافظ ابراہیم اپنے اندر اک احساسِ محرومیت لئے ہوئے بھی تھے۔

ان کی شخصیت فقر و فاق، محتاجی، ریقق القلمی، غایت درجہ کی لطافت، نرمی، سچائی، بے باکی، منکسر المزاجی، خدمتِ خلق سے معمور، حادثِ زمانہ کی تلخیوں کا شکار اور زندہ دلی کا مرکب تھی۔ وہ بچپن سے ہی المناک قسم کے صورت حال سے کئی دفعہ دوچار ہوئے، جس سے ان کا طبعی رحجان یا س ونا اُمیدی اور غم و غصہ کی راہ اختیار کرنے پر مجبور ہوا تھا۔ لیکن وہ مایوس گُن حالات میں بھی جدوجہد اور سرگرم عمل رہنے کا جذبہ رکھتے تھے۔ انہوں نے جب بھی کوئی کام کیا تو یہ سمجھ کر دل و جاں سے اس میں کوشش ہوتے تھے کہ وہ ایک آزادانہ اور پُر اعتماد زندگی گزار سکیں۔ ان کی اسی کوشش کے بارے میں عبدالطیف شیرازہ قمطراز ہیں:

”حاولَ حافظَ أَنْ يَصْبَحَ رَجُلًا وَيَعْتَمِدَ عَلَى نَفْسِهِ فِي تَحْصِيلِ قُوَّتِهِ“^۱

ان کے اندر رچی بسی انقلابی ذہنیت یا یوں کہئے کہ ان کی طبیعت میں پوشیدہ انقلابی خصلت نے انہیں نہ صرف مصر کا صفتِ اول کا شاعر بلکہ عوام کی امنگوں اور آرزوؤں کا ترجمان شاعر بنادیا۔

حافظ ابراہیم اور اقبال کے درمیان موضوعات، اسلوب، فکر و فن اور اندازِ بیان کا تقابی جائزہ

شاعر نیل حافظ ابراہیم کے شعری موضوعات جن کا زیادہ تر حصہ مدحیہ قصاید، نظموں اور مرثیوں پر مبنی ہے دراصل ان کے دور کی سیاسی، اجتماعی، معاشرتی، تاریخی اور سماجی احوال و واقعات کا پُر اثر بیان ہے جس سے انہوں نے ایک طرف مصری عوام کے حزن والم در غم، فقر و غربت اور تنگستی کی ترجمانی کا حق ادا کیا ہے تو دوسری طرف انہوں نے قوم کے خوابیدہ ضمیر کو جھنجھوڑنے کا فرض بھی نبھایا ہے۔ ان کے موضوعات ان کی اپنی روزمرہ زندگی میں پیش آید مشکلات و مسائل سے شروع ہو کر، ان کے دور کے قومی، سیاسی اور سماجی مسائل کے وہ شب و روز ہیں کہ جن کو شامل کئے بغیر جدید مصر کی قومی، مذہبی، سیاسی اور ادبی تاریخ نامکمل ہے۔

حافظ ابراہیم کی شاعری کی روح اور موضوعات کو جانچنے اور پرکھنے کے لئے ان کے ماضی کی تلخ و شیریں یادوں کو گردیدنے یا پھر حال کی آراؤ افکار کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ان کی شاعری ہر اس مصری شخص کی کہانی ہے جو اس وقت اپنے تمام آلام و مصائب کا بوجھ اٹھائے گر دشیں لیں وہاڑ کا مقابلہ کر رہا تھا۔ ان کے احساسات و جذبات کو حافظ ابراہیم نے اپنی شاعری کی حسین اور موسیقیت بھری زبان عطا کی۔ ان کی شاعری ان کی ذاتی زندگی کے مسائل و مشکلات، قومی اور وطنی واقعات، عام آدمی سے تعلق رکھنے والے روزمرہ کے مسائل اور سماج میں پروژش پانے والی بُرا نیوں کا آئینہ تھی۔ انہوں نے جس طرح سے مصر اور عرب کے سیاسی، سماجی، تہذیبی، اقتصادی اور معاشرتی واقعات و معاملات کی حسین انداز میں عکاسی کی ہے وہ نہ صرف عربی ادب کے لئے ایک بیش قیمت سرمایہ ہے بلکہ اس دور کی ایک مستند تاریخ بھی ہے جو آج

بھی چٹارے لے کر پڑھی جاتی ہے۔ حافظ ابراہیم نے اپنی شاعری کو ایک صحت مند سماج کی تعمیر کے لئے ایک ذریعے کے طور پر استعمال کیا۔ وہ ایسے شاعر تھے جو عام و خواص میں یکساں طور پر مقبول تھے۔ وہ عوام کے رفیق تھے کیونکہ ان کے دُکھ درد کو حسین الفاظ کا پیر ہن پہنا کر، اُس کا مدارا ڈھونڈ کرنے صرف ان کی ترجمانی کرتے بلکہ ان کے دُکھ درد کو بانٹنے کے سامان بھی بھی بھیں پہنچاتے۔ دوسری طرف خواص اُسے اپنے رجحانات و خیالات کا نقیب سمجھتے۔

حافظ ابراہیم کی شاعری قومی رجحانات کی آئینہ دار تو ہے، ہی لیکن ان کے یہاں عربی و اسلامی رجحانات کی بازگشت بھی سُنائی دیتی ہے۔ اپنی شاعری کے ذریعے انہوں نے متعدد بار عربی ممالک کے درمیان اتحاد و اتفاق پر زور دیا ہے۔ بقولِ نسیمہ فاروقی:

”اس لحاظ سے شوّقی کی طرح ان کو بھی عرب اتحاد کا پیغام بر اور نقیب کہا جا سکتا ہے۔“^۱

حافظ ابراہیم کی شاعری کے موضوعات رنگارنگ ہیں۔ ان میں تخت خلافت کی مدح میں قصاید ہیں، انگریزوں کے تیس خوشامدی قصیدے اور ان کے ظلم و ستم کے خلاف غم و غصہ اور لعنت و ملامت، ہجہ اور درد بھرے مرثیے ہیں، قوم کی ترجمانی میں پُر جوش و جواں وطنی جذبات ہیں، مزاحمت اور جہاد کے نغمے ہیں، مصر کے ماضی کی عظمت کی فخریہ داستانیں ہیں، اس کی زمین، ہوا و اؤں اور عظیم عمارتوں کی تعریفیں ہیں۔ عورتوں کی شجاعت کے قصے ہیں اور ان کی تعلیم کی افادیت اور اثرات کے نغمے ہیں، تاریخ کے حقائق ہیں، عربی زبان کی افادیت کا بیان ہے، اردوگرد کے واقعات اور سماجی مسائل ہیں۔ الغرض وادی نیل میں رونما ہونے والے سبھی حادثات و واقعات کی بازگشت ان کی شاعری میں سُنائی دیتی ہے۔

۱۔ نسیمہ فاروقی، جدید عربی شاعری، (اشاعت: اگست ۱۹۷۴ء، اسلامک بگ سینٹر لکھنؤ)، ص۔ ۸۹۔

حافظ ابراہیم کی شاعری قدامت اور جدیدیت کا سنگم ہے۔ ان کے اسلوب اور ہیئت میں قدامت پسندی کا پڑا زیادہ بھاری ہے۔ جدید تشبیہات و استعارات کا استعمال اس قدر مناسب مقدار میں ہے کہ دل عش کر اٹھتا ہے۔ ان کے اسلوب کے عناصر ترکیبی میں ان کی زبان کی پختگی، اندازِ بیان کی متانت اور تراکیب کی جزالت شامل ہیں۔ اس کے علاوہ محکمات، جذبات نگاری اور منظر کشی میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتے۔

حافظ ابراہیم کی نظمیں بے با کی کی علامت ہیں۔ وہ قصائد میں بے اندازہ تمثیل و طنز کے تیرچلانے کے ماہر ہیں۔ ان کے مضامین میں ایک نیا پن اور ان کی شاعری جدید اختراعات کے علاوہ زور بیانی، جزالت اسلوب، صراحت قول اور اصالت فکر جیسے گوہروں سے مالا مال ہے۔

چونکہ حافظ ابراہیم کی زندگی بچپن سے ہی درد غم کے سائے میں پروان چڑھی تھی اس لئے ان کی شاعری میں اس قدر سوز و گداز شامل ہو گیا تھا کہ جب وہ سادہ الفاظ میں اپنے مخصوص طرز بیان میں سلیس اور لکشی کے ساتھ قوم کے رنج و محن کی داستان سُنتے تو یوں لگتا کہ ان کے اشعار غموں کی تپش میں اشک بہار ہے ہوں۔ انہوں نے بجا طور پر حدیث ذات کو حدیث روزگار میں ڈھال دیا تھا۔

علامہ اقبال گزشتہ صدی کے بر صغیر کے ایک عظیم مفکر شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنی دانشوری، فنِ شاعری کے متعلق ان کی غیر معمولی علمیت و بصیرت، جدید فلسفے سے گہری واقفیت اور احترام آدمیت و انسانی غمhopواری کے شدید جذبے سے پورے عالم انسانی کو یکساں متاثر کیا ہے۔ ان کی شاعری زماں و مکاں کی قیود و حدود سے پرے نہ صرف اپنے

عہد کے سیاسی اور سماجی اُتار چڑھاؤ کا احاطہ کرتی ہے بلکہ عالمگیر سطح پر پوری انسانیت کے لئے ان مسائل اور اسرار اور موز کی بھی نشاندہی کرتی ہے جن کا تعلق بنی نوع انسان سے ہے۔ اُن کے کلام کے پچھے روایات، عالمی ادب سے واقفیت، زمانے کے اُتار چڑھاؤ، مذہب، اخلاقیات، سائنس، فلسفہ، منطق اور عمرانیات کی رنگارنگ اور گوناگون دُنیا ہے۔ اُن کی شاعری میں زندگی سے تعلق رکھنے والے سبھی مضامین ملتے ہیں اور یوں یہ زندگی کی ایک مدل اور مکمل تصویر یا تفسیر پیش کرتی ہے۔ سردار جعفری اُن کے بارے میں یوں رقمطر از ہیں:

”ابھی تک اردو زبان نے اقبال سے بڑا شاعر پیدا نہیں کیا ہے۔ وہ ہمہ گیری

اور وسعت ابھی کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوئی جو اقبال کی شاعری میں پائی جاتی ہے۔“

علامہ اقبال کو مُفکر شاعراس لئے کہا جاتا ہے کہ انہوں نے فِر اور شعر کی آمیزش سے ایسا محلول تیار کر لیا ہے جو کہ حیاتِ انسانی کے لئے اکسیر ثابت ہوا ہے۔ انہوں نے شعر کی لطافت کو کسی طرح کا گزند پہنچائے بغیر حکیمانہ لب و لہجہ عطا کیا ہے جس کی وجہ سے اُن کی شاعری حکیمانہ ہو گئی ہے۔ بقول رشید احمد صدقی:

”اقبال کی شاعری خود شاعری کی معراج ہے۔ انہوں نے جذبات کو فکر کا

درجہ دے دیا ہے اور فکر کو جذبات کا آب و رنگ بخشنا ہے۔“

اقبال بنی نوع انسان کے لئے ایک ایسی دُنیا ڈھونڈنا چاہتے تھے جہاں انسانیت سب سے معتبر ہو۔ جس میں آدمی ایک زندہ تمباکے ساتھ جی سکے جو کہ اُس کے قلب و روح میں جوش اور ولہ پیدا کر سکے۔ اُن کے نزدیک فن کا مقصود خیالات میں انقلاب پیدا کرنا ہے۔

اقبال آپنے علمی اور فنی لحاظ سے اپنے پیشروؤں اور معاصرین کے مقابل میں گزشتہ صدی کے سب سے عظیم شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں مشاہدے اور تجربے کی ایک وسیع کائیںات ہے۔ انہوں نے شاعری کے پیام کو حد بندیوں سے باہر نکال کر نئے آسمانوں، نئے مشاہدات، تجربات اور فکر کی رفتار سے ہمکنار کر کے اسے لامحدودیت سے ہمکنار کیا۔

ڈاکٹر شیمہ رضوی کے مطابق:

”اقبال ایک پیغام رسال شاعر ہیں۔ انہوں نے شعر کے ظاہری بناؤ سنگار کے مقابلے میں فکر و معنویت پر زیادہ زور دیا۔ اپنے مقصد کی ادائیگی اور اس کی ترسیل کے لئے کچھ تو نئی علامتیں وضع کیں اور کچھ کوئی معنویت کے ساتھ استعمال کیا۔ اقبال کی غزلیں ہیئت کے اعتبار سے بھی جد اگانہ ہیں مثلاً مطلع و مقطع سے انحراف یا ”نظم نما“، مسلسل غزلیں وغیرہ۔ اسالیب و تصورات کے فرق کے باوجود اقبال کے تغزل کی روایات وہی ہیں۔ انہیں روایات میں اقبال نے اجتہادات کئے، ان کی تجدید و توسعہ کی اور ان میں اضافے کئے۔ فارسی میں ”پیامِ مشرق“ اور ”زبورِ حجم“ اور اردو میں ”بانگِ درا“، ”ضربِ کلیم“ اور ”بالِ جبریل“ کی غزلیں غزل کی بلند ترین منزلوں کی نشاندہی کرتی رہیں۔^۱

اقبال کی شاعری کی خصوصیات پر تبصرہ کرتے ہوئے مشہور قلمکار خشونت سنگھ، رفیق ذکریا کی کتاب ”اقبال۔ شاعر اور سیاستدان“ کے تعارف میں لکھتے ہیں:

”از راپاونڈ نے شاعری کی تین اقسام متعین کی ہیں۔ غنائی شاعری جس

کے الفاظ میں موسیقی ہوتی ہے، ذہنی شاعری جس کے الفاظ دانش سے معمور ہوتے ہیں اور نظریاتی شاعری جو تصورات پر بنی ہوتی ہے۔ اقبال کی شاعری میں یہ تینوں اجزاً از راپاونڈ کی متعین کردہ ترتیب کے ساتھ موجود ہیں،^۱۔

اقبال کی شاعری اپنے معیار کے لحاظ سے آہنگ، اسلوب اور انداز کے نئے دفتر کھوتی ہے۔ اُن کی شاعری میں فکر و فون کی اس قدر نیرنگیاں ہیں کہ ان کے فکر و خیال کے ایک ایک پہلو سے کئی نکات اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ فکر و فلسفہ کی گٹھیاں سلب جھانے کی بات ہو یا حسن و جمال کے سحر خیز جلوؤں کی تابانیوں کا بیان، اقبال کی شاعرانہ فن کاری اور سحر کاری ہر رنگ میں موجود ہے۔ اقبال کا اندازِ بیان اگرچہ فلسفیانہ ہے مگر یہ انداز اُن کے جوش بیان پر حاوی نہیں ہوتا۔ اس سے الفاظ کی سادگی اور عبارت کی سلاست پر بھی کوئی اثر نہیں پڑتا بلکہ اُن کے اندازِ بیان میں جوش و ولولہ کی غالیت سے کلام کی دلاؤیزی میں اضافہ ہو جاتا ہے اور نتیجے کے طور پر اُن کے فلسفیانہ خنثیں قسم کے موضوع بھی شوخی اور زنگینی اختیار کر لیتے ہیں۔ اقبال کا اندازِ بیان نہایت پاکیزہ ہے۔ اُن کے تختیلِ شعری کی پرواز نہایت ہی بلند ہے۔ اُن کی زبان میں روانی، جوش اور تاثیر ہے۔ اُن کی شاعری نکتہ آفرینی اور مجذز نگاری کے جلوے اپنے اندر سمائے ہوئے ہے۔

اقبال کی شاعری تغزل بھی ہے اور ترنم بھی۔ اس میں ایک طرف بندشوں کی چُستی ہے تو دوسری طرف شوکتِ الفاظ کی فراوانی، الغرض مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ اُن کی شاعری میں قطب قلی شاہ کی سرمستی، میر کی دروں بینی، غالب کی فلسفہ طرازی، داغ کی زبان، شبلی و حالی کی قومیات اور فلسفہ حرکت و حیات، نظیراً کبریٰ آبادی کا کھلنڈ راپن اور میرا نیس کی رسائی فکر سب شامل ہیں۔

^۱ رفیق ذکریا، اقبال، شاعر اور سیاستدان، (تعارف از خشونگ سلگھ)، ص۔ ۲۲۔

علّامہ اقبال اور حافظ ابراہیم میں قدر مشترک

مصر و ہندوستان کی سر زمین ہمیشہ سے ہی اپنی زرخیزی کے لئے مشہور ہے۔ یہاں کی تہذیبوں نے ماقبل تاریخ سے ہی بنی نوع انسان کو تمدن کے طور طریقے سکھلانے۔ یہاں کی مٹی نے بے شمار عالموں، دانشوروں اور شاعروں کو جنم دیا ہے۔ جنہوں نے اپنی قابلیت اور خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے علم و ادب کے آسمان پر ستاروں کی طرح انسانی دُنیا کو روشنی اور رہنمائی فراہم کی۔

ستاروں کے اسی بھرمنٹ میں دو درخشندہ ستارے اقبال اور حافظ ابراہیم ہیں۔

اقبال مشرق کے افق سے طلوع ہوئے جبکہ حافظ ابراہیم نیل کے ساحل سے جلوہ گر ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ساری دُنیا کو منور کر دیا۔ دونوں شعراء نے اپنی شاعری کو انسان دوستی اور دردمندی کے جو ہروں سے آشنا کر کے شاعری کے موضوعات کی سابقہ حد بندی توڑڈالی اور سماجی اور قومی خیالات کو اپنی شاعری کا ماحاصل بنایا۔ اگر یوں کہا جائے کہ انہوں نے بنی نوع انسان کو اپنا آفاقتی پیغام دینے کے لئے شاعری کو اپنا آلہ کا ربانیا تو بے جانہ ہوگا۔

اقبال اور حافظ ابراہیم ہم عصر شعراء تھے جو کہ ایسے وقت میں پیدا ہوئے جب دونوں کے وطن انگریزوں کی غلامی میں جکڑے ہوئے تھے اس لئے اس بات میں کوئی دورائے نہیں کہ دونوں نے کم و بیش ایک ہی طرح کے سیاسی اور اقتصادی حالات میں آنکھ کھولی اور سن شعور کو پہنچے۔

سب سے پہلی چیز جس میں دونوں شعراء میں مماثلت نظر آتی ہے، وہ ہے ”اسلامی شعور“ دونوں اس کے علمبردار اور پیغام بر تھے۔ علامہ کے تمام فکر و نظر کا سرچشمہ قرآن مجید ہے۔ اسی سے ان کا دل مستفیض ہوا اور اس کی حکمت کو انہوں نے اپنے تمام افکار و نظریات کا منبع و مرجع بنایا۔ قرآن کریم کی اسرار فہمی سے ان کے اندر ایک ایسی بصیرت پیدا ہو گئی جس سے ان

کا شعر ایک غیر معمولی قوتِ موثرہ کا حامل بن گیا۔ اُن کے انہی خصائص کے سبب اُن کو
شاعرِ قرآن کہا گیا ہے اور وہ بھی اعتماد کے ساتھ اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں
گر دلم آئینہ بے جو ہر است

در بحر فم غیر قرآن مضمر است

روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا

بے نصیب از بو سه پا گن مرا

اُدھر حافظ ابراہیم کی شاعری میں دوسرے رنگوں کے ساتھ اسلامی رنگ بھی جھلکتا ہے۔ بعض
حضرات تو اسلام کو حافظ ابراہیم کی شاعری کی اساس قرار دیتے ہیں۔ وہ اپنے اشعار میں حضرت سلیمان
کی بادشاہت کا جاہ و جلال، حضرت عیسیٰ کی مسیحانی کا کمال اور حضرت یوسف کا حُسن و جمال بیان
کرتے ہوئے ان پیغمبروں کی برگزیدگی کا اظہار کرتے ہیں۔ مزید برآں وہ حضرت عثمان گو جامع
قرآن اور حضرت عمر گو صداقت کے پاسبان کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ ان سب کے پیچھے اُن
کا مقصد یہ تھا کہ لوگ اسلام کے اُس ذریں دور کو یاد کر کے اپنے حال کو اُسی طور پر استوار کریں۔

دونوں شعر اسی شعور اور سیاسی معاملات کی گہری بصیرت رکھتے تھے۔ اُنہوں نے
اپنی پُر جوش شاعری کے ذریعے اپنے ہم وطنوں کے دلوں کو گرمایا اور یوں اُنہیں درس
بصیرت دیا۔ اُنہوں نے اپنے وطن ہی نہیں بلکہ دُنیا کے ہر اہم اور قابل ذکر واقعہ کو اپنے
اشعار کا خوبصورت پیرا ہن عطا کیا تاکہ اس سے سبق حاصل کیا جاسکے۔ دونوں شعراء نے
نوجوان طبقے سے خصوصاً خطاب کیا ہے۔ اُنہوں نے جوانوں کو لہو و لعب میں مست رہنے پر
اُن کی سخت سرزنش کی ہے اور اُنہیں مسلم تدبیر اختیار کرنے کی تلقین کی ہے۔

کبھی اے نوجوان مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے ٹوٹا ہوا تارہ
(اقبال)

تعلیم نساں کو دونوں شعراء نے ایک طرح سے ضروری قرار دیا ہے لیکن ساتھ ہی
ساتھ انہیں آزادی کے نام پر بے راہ روی سے ٹوکا ہے اور اُس علم کو موت کی مانند قرار دیا ہے
جوعورت سے اُس کی حیا اور شرم چھین لیتا ہے
حافظ ابراہیم
.....

الْأُمُّ مَدْرَسَةٌ إِذَا عَدَ دَتَهَا

أَعْدَدَ شَعْبًا طَيْبَ الْأَعْرَاقِ

(ترجمہ: ماں ایک مدرسہ کے متزلف ہے۔ اگر اس کو تم نے علم و آگہی سے آرائنے کیا تو آپ نے ایک قوم کو سنوارا جس کی جڑیں پوستہ ہوں۔)

اقبال.....

تہذیب فرنگی ہے اگر مرگِ اموت
ہے حضرتِ انسان کے لئے اس کا ثمرموت
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظرموت
بیگانہ رہے دین سے اگر مدرسہ زن
ہے عشق و محبت کے لئے علم و ہنرموت

اقبآل اور حافظ ابراہیم کے درمیان جو چیز سب سے زیادہ مشترک تھی وہ ہے ”قومی شعور“۔
 دونوں شعراء نے قومی شعور کا بہترین مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی شعلہ نوائی سے اپنی قوموں کے
 مُردہ دلوں میں روحِ حیات پھونک دی۔ اس شعور کی نشوونما کے لئے کئی محركات کا فرماتھے
 جیسے کہ دونوں شعراء کا اپنی قوم کے تینیں ایک دردمند دل، اُن کا ایک نئے اور صحت مند معاشرے
 کی تعمیر کے لئے سماج میں ہنگامہ آرائی پر یقین اور اُن کے مزاج میں رچی بسی خودداری جو کہ کسی
 بھی صورت میں غلامی برداشت کرنے کے اہل نہ تھی۔ دونوں شعراء کی شخصیت میں وطن پرستی
 کے عنصر شامل تھے۔ دونوں نے وطن کی محبت میں سرشار ہو کر ایسے ترانے گائے جو کہ لوگوں
 کے دلوں میں سما گئے۔

اقبآل.....

سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا
 ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستان ہمارا
 حافظ ابراہیم.....

وقف الخلق ينظرون جميعا
 كيف أبني قواعد المجد وحدني

(Translation: Stop creation see all how my sun and my glory rules.)

بقول جاوید اقبال:

”اقبآل وہ پہلے شاعر تھے جنہوں نے ہندوستان میں وطنیت کے جذبے کو فروغ دیا“^۱۔

اور بقول شوقی ضیف:

^۱ جاوید اقبال، زندہ رو: حیات اقبال کا تکمیلی دور، (مطبوعہ غلام علی پبلشرز لاہور، اشاعت اول، ۱۹۷۹ء)، ص۔ ۹۲۔

”حافظ ابراہیم وہ پہلا شاعر ہے جس نے مصری قوم کی آواز پر لبیک کہا اور
ان کی ترجمانی کا بیڑہ اٹھایا“۔^۱

اقبال اور حافظ ابراہیم نے اپنی شاعری کے ذریعے تعلیم جیسے موضوع کو خاص اہمیت
دی ہے اور اس معاملے میں اپنے وقت کے حکمرانوں کو تلقین کی ہے کہ وہ بچوں کو تعلیم سے
بہرہ مند کرنے کے لئے ہر ممکن اقدام اٹھائیں۔ اس ضمن میں دونوں شعراء نے اپنے اپنے
ملک کی عدم دلچسپی اور غیر سنجیدگی کو افسوسناک قرار دیا ہے۔ حافظ ابراہیم نے متنبہ کرتے
ہوئے کہا ہے ۔

أنقذوا الطفل فإن في شقة

ال طفل شقاء لنا على كل حال

أنقذوه فربما كان فيه

مصلحة أو مفامر لا يبالى

(ترجمہ: بچوں کو مشکلات سے بچاؤ کہ ان کی مشکلات میں بہر صورت ہماری مشکلات مضر

ہیں۔ انہیں بچاؤ کہ شاید انہی میں کوئی مصلح یا جان باز پیدا ہو)

علامہ اقبال نے بھی اسی انداز میں اساتذہ کی غیر سنجیدگی اور صحیح تعلیم و تربیت نہ دینے
پر اپنی شکایت کا اظہار کیا ہے ۔

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے

سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

۱۔ ڈاکٹر شوقی ضیف، جدید عربی ادب، (الكتاب انٹرنشنل جامعہ گلری، نئی دہلی، سال اشاعت جنوری ۲۰۰۵ء)، ص۔ ۱۳۵۔

اقبال اور حافظ ابراہیم کے درمیان یہ فکر بھی مشترک ہے کہ قوموں کے فخر کی بُنیادِ علم، ادب، فن اور اختراعات پر ہونی چاہیے۔ وہ انسانیت کی بیداری کے لئے علم کی حصولیابی پر زور دیتے ہیں۔ یہ دونوں شعراءً مغربی تہذیب کی ریشہ دو انبیوں کے خلاف تھے۔ انہیں اس بات کا زبردست احساس تھا کہ اُن کا قومی اثاثہ طالم اور غاصب قوموں کے فائدے کی چیز بن رہا ہے۔ انہوں نے خصوصاً مغرب کا ذکر کرتے ہوئے اُن کی تہذیب پر سخت چوت کی ہے اور کہا ہے کہ یہ تہذیب اپنی گرتی ہوئی اخلاقی قدروں کی وجہ سے خودکشی کی جانب بڑھ رہی ہے اور جلد ہی مٹ جائے گی۔ دونوں شعراءً قوموں کی ترقی و تقدم کے لئے جو اسباب وضع کرتے ہیں ان میں ایک اہم سبب اخلاق ہے۔ اُن کے مطابق سماج کی بُنیاد کا سب سے بہترین ستون اخلاق ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی دونوں شعراءً مغربی علم و فن کے دلدادہ تھے اور اسے بنی نوع انسان کی ترقی کے لئے فعال سمجھتے تھے۔

اقبال اور حافظ ابراہیم دونوں مسلم قوم یعنی امت کے وحدت کی بات کرتے ہیں۔ اس ضمن میں حافظ ابراہیم تمام عرب قوم کو ایک فصح و بلیغ زبان یعنی ”عربی“ کی لڑی میں پرونا چاہتا ہے۔

اری لرجال الغرب عزّ او منعة

وَكَمْ عَزَّاقُومْ بِعَزِّ الْغَفَاتِ

(ترجمہ: میں اقوام مغرب کو عزت و بلندی اور حفاظت و پناہ میں دیکھ رہی ہوں اور بارہا

زبانوں کے غلبہ و قوت سے ان زبانوں کو بولنے والی قومیں بھی غلبہ و قوت سے ہمکنار ہو گئی ہیں)

وہ زبان کو اساس بنا کر عرب قوم کے وحدت کی بات کرتا ہے اور یوں وہ قومیت کے چھوٹے دائرے سے نکل کر پورے عالم عرب کی وحدت کے لئے ایک دائی کے طور پر ابھرتا ہے۔ علامہ

نے بھی وحدت کی بات کہی ہے لیکن ان کے وحدت کی اکائی عرب قوم نہیں بلکہ مسلم قوم اور ملت ہے۔ وہ رنگ و سل اور علاقائیت کے بُتوں کو توڑ کر ملت میں ضم ہونے کی بات کرتا ہے۔

بُناں رنگ و بُوکو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کرتا بخاکِ کاشغر
اقبال اور حافظ ابراہیم نے ”دریائے نیل“، کو متعدد بار رمز بنا کر پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے دریائے نیل کی لہروں، اس کی خاموشی، اس کی تیزی و تندری اور اس کے بلوریں پانیوں کی تعریف کر کے اسے خوبصورتی، دلکشی اور جاذبیت کا شاہکار نمونہ بنا کر پیش کیا ہے۔
حافظ ابراہیم:.....

اولم يَكْن لَكَ يَا مَلَكُ مَصْرُونِيْلَهَا

يَنْتَابُ بَيْنَ مُرْوِجَهَا الْأَفِيَّاحِ

مَنْصُورَةُ الْجَنَّاتِ جَالِيَّتِهِ الرَّبُّ

مَطْلُولُ السَّرَّحَاتِ وَالْأَرْوَاحِ

(ترجمہ: کیا تمہارے لئے اے ملک مصر اور اس کے نیل، ایسے پے در پے میدان نہیں ہیں جو نہروں کے بعد تسلسل سے ابھر کر بہتے ہیں۔ اور منصورہ اور اس کے ہریالے باغات و میدان، جن میں شبنم کی ہریالی اور روحوں کی تازگی کا سامان ہے۔)

اقبال:.....

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقاً ب نیل
ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آب نیل
”یا“

چرخ نے بالی چڑالی ہے عروس شام کی ؟
نیل کے پانی میں یا مجھلی ہے سیم خام کی ؟
رہے گا وادیٰ نیل و فرات میں کب تک
تیرا سفینہ ہے بحر بیکراں کے لئے
حافظ ابراهیم:.....

لِلنَّيلِ مَجْدُ فِي الزَّمَانِ مُؤْثِلٌ

مِنْ عَهْدٍ (آمُون) وَعْهَدٍ (فَتَاحٍ)
(ترجمہ: دریائے نیل کو عہد آمون اور عصر فتاح سے ہی مضبوط بنیادوں پر قائم شرف حاصل ہے۔)

اقبال:.....

اس کی زمیں بے حدود اس کا افق بے شغور
اس کے سمندر کی موج دجلہ دینوب و نیل!
خود ہے زندہ تو دریا ہے بیکرانہ ترا
ترے فراق میں مضطرب ہے موج نیل و فرات
حافظ ابراهیم نے اس دریا کے نام کو اپنے دیوان میں اس قدر زیادہ استعمال کیا ہے کہ
علمائے ادب نے انہیں ”شاعر نیل“ کا خطاب عطا کیا ہے۔

اقبال اور حافظ ابراہیم نے اپنے کلام میں ہمیشہ اپنی تہذیب، قوم اور سماج کی بھرپور ترجمانی کی ہے۔ دونوں شعراء نے اپنے کلام کو سماج اور ماحول کی صحت مند تبدیلی کے لئے ایک ذریعہ کے طور پر استعمال کیا۔ انہوں نے اپنی تہذیب اور سماج کی ترجمانی کرتے ہوئے اپنے عہد کے مزاج اور اپنی تہذیب و ثقافت کے درمیان ایک تعلق قائم کیا۔ دونوں شعراء اپنی شاعری کے ذریعے اپنے وقت کے فکری مسائل میں شریک ہوئے اور ان پر اپنی دانشورانہ رائے کا اظہار کیا۔

دونوں شعراء نے ماضی اور اسلاف کے کارناموں کی تعریف کی ہے تاکہ اس سے موجودہ نسل کو تحریک مل سکے۔ وہ ساری دُنیا کو اپنی عظمتِ رفتہ کا احساس دلاتے ہوئے اُن کے دلوں کو جذبوں سے بھر دیتے ہیں۔ اُن کی شعلہ فشاں اور پُر جوش شاعری نے انہیں انقلابی شاعر بنادیا ہے۔

حافظ ابراہیم اور اقبال کی شاعری میں جو قدر مشترک ہے وہ اُن کی شاعری میں قدیم و جدید عناصر کا ایک حسین، معتدل اور خوشنگوار امتزاج ہے۔ اُن کے اسلوب اور ہیئت میں اگرچہ قدامت پسندی کا زیادہ چلن ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ جدید تشبیہات و استعارات کا عام استعمال بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ زبان کی چختگی، تراکیب کی جزالت، انداز بیان کی ممتاز دونوں شعراء کے اسلوب کے مشترکہ عناصر ترکیبی ہیں۔ محکمات، جذبات، نگاری اور منظر کشی پر دونوں شعراء کو ملکہ حاصل ہے۔ دونوں شعراء کی شاعری میں جدید اختراعات اور نئے مضامین دیکھنے کو ملتے ہیں۔ زور بیانی، جزالت اسلوب، صراحت قول اور اصلاح فکر دونوں شعراء کے مشترکہ گوہر ہیں۔ دونوں شعراء کے بیہاں لفظی صنائع بدائع کا گزر نہیں اور نہ اُن کی شاعری

لفظی صنعت گری کا نمونہ ہے۔ دونوں شعراء نے اپنے اشعار کو قومی، سماجی، معاشرتی، اخلاقی اور مذہبی اصلاحات کے لئے اکسیر کے طور پر استعمال کیا ہے۔

اپنی شاعری میں حافظ ابراہیم اور علامہ اقبال کے درمیان خیالات میں قدر مشترک کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

حافظ ابراہیم:.....

إِذَا أَخْصَيْتُ أَرْضَ وَأَجْدَبَ أَهْلَهَا

فَلَا أَطْلَعْتُ نَبَّاتًا وَلَا جَادَهَا السَّمَاءُ

(ترجمہ:۔ اگر زمین زرخیز ہو اور اس کے باشندے قحط زدہ (بخل) ہوں تو یہ زمین نہ کوئی پودا

اگاتی ہے اور نہ ہی آسمان اس پر فیضان برساتا ہے۔)

اس شعر میں حافظ ابراہیم استعمار کے زیر اثر ملک یعنی مصر کی زبوں حالی کا تذکرہ کرتے ہوئے قوم کو ایک انقلاب کی طرف بُلانے کی سعی کرتے ہیں۔

علامہ اقبال بھی بعضیہ مثل انہی الفاظ سے اسی انقلاب کی بات کرتے ہیں ۔

أُنْهُو مِيرِي دُنْيَا كَعَرْيَوْنَ كَوْجَانَ دُو

کاخِ اُمرا کے درود یوار ہلا دو

جس کھیت سے دھقاں کو میسر نہ ہو روزی

اُس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو

ایک اور جگہ حافظ ابراہیم انگریزوں سے مخاطب ہو کر اپنی قوم کی بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے یوں گویا ہوتے ہیں ۔

أنت جلا دنا فلا نفس أنا

قد لبسنا على يديك الحدادا

(ترجمہ: اے جلا! تم یہ نہ بھولو کہ تمہارے ہاتھوں ہم نے چھکڑی پہنی)

علّا مہ اقبال بھی انہی خیالات کو اسی طرح حسین پیرائے میں بیان کرتے ہیں ۔

اے طاڑ لا ہوتی اس رزق سے موت اچھی

جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتا ہی



☆.....پانچواں باب

شاعرِ مشرق اور شاعرِ نیل (حاصلِ تحقیق)

کسی بھی دو چیزوں کے محاسن اور عیوب کا موازنہ تکلیف دہ ہوتا ہے لیکن جب بات عظیم شخصیات سے متعلق ہوتا ان کے اندازِ فکر کو سمجھنے کے لئے بعض اوقات یہ موازنہ ضروری ہو جاتا ہے تاکہ ان کی ہمہ جہتی شخصیت کے پہلوؤں کی صحیح انداز میں عکاسی ہو سکے۔ علامہ اقبال اور حافظ ابراہیم اپنے اسلوب، فنِ محاسن، موضوعات اور افکار کے اعتبار سے اپنی کائینات میں عظیم تر تھے۔ ان دونوں شعراء کے درمیان تقابلی جائیزہ اور قدرِ مشترک جان کر ہمارا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ دونوں میں سے کسی ایک کو دوسرے پر فویت دی جائے یا ان کو کلام کے معیار کے اعتبار سے درجہ بندی میں رکھا جائے بلکہ غرض یہ ہے کہ دونوں شعراء کے کلام پر ایک تحقیقی نظر ڈال کر اس حقیقت کو آشکارا کیا جائے کہ عظیم شعراء کس طرح سے اپنی قوموں کو ایک نئی جہت اور سمت عطا کرتے ہیں۔ مزید یہ کہ ان کے کلام میں رچے بسے ان پہلوؤں کو بھی اُجاگر کیا جائے جن کی تاثیر سے قوموں کا خون گردش کرنے لگتا ہے۔ ان کے اندر زندہ تمباپیدا ہو جاتی ہے۔ جو ان کی روحوں کو تڑپاتی ہے اور قلوب کو گرماتی ہے اور اس قدر تحریک بخشتی ہے کہ وہ ایک انقلاب کا باعث بن جاتے ہیں۔

حافظ ابراہیم مصری جدید عربی ادب کے ابتدائی دور میں عربی شاعری کے نخلستان میں اپنے متنوع رنگوں کی بہار لے کر وارد ہوئے۔ اس دور میں قدیم عربی ادب روایت سے تجدید کی جانب گامزن ہوا تھا جس کی دو بنیادی وہ ہیں قومی شعور کی بیداری اور علوم و فنون کی ترقی تھیں۔ فکری، عقلی اور روحانی انقلاب نے شاعری کی تجدید میں اہم روپ ادا کیا اور یوں عربی شاعری ریاضی کی گل تھیوں، پہلیوں، صنائع بدائع کی پُر تکلف صنعتوں اور خماسیات و

تصمیمات کی بیڑیوں سے آزاد ہوئی۔ جدید شاعری محض نئے زمانے کی وجہ سے جدید نہیں کھلائی بلکہ اس میں ہیئت اور مواد کے اعتبار سے غیر معمولی تغیر واقع ہوا۔ یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ متنبیٰ اور شریف رضیٰ کے بعد بارودی اور حافظ ابراہیم نے پہلی بار جس طرح کی عربی شاعری کا چلن رانج کیا، وہ لوگوں کے قلب و نظر اور جذبات و فکر کی تسکین کا باعث بنی۔

حافظ ابراہیم نے جدید عربی شاعری کو زندگی کے ساتھ آشنا کر دیا اور یوں زندگی کے ہزاروں رنگوں کی طرح عربی شاعری بھی اپنے متنوع رنگ بکھیرنے لگی۔ چونکہ زندگی سے جڑے مسائل میں موضوعات کی بھرمار تھی اس لئے انہوں نے عربی شاعری میں مافق الفطرت خیالات کے بجائے یہی مسائل اور گرد و پیش میں رونما ہونے والے چشم دید و اقuated و تغیرات کو غنانیت میں رچا ہوا ہجہ عطا کیا، جو کہ قارئین و سمیعنی کو اپنے جذبات و احساسات کا مکمل ترجمان لگا۔

حافظ ابراہیم نے فطری شاعری کو ایک بار پھر سے رانج کر دیا۔ انہوں نے شاعری کا رُخ معاشرتی، سماجی، دینی اور سیاسی رجحانات کی طرف موز دیا۔ وہ حالاتِ حاضرہ اور گرد و پیش بیان کرنے والے شاعر تھے۔ اُن کی شاعری مصری سماج کا صاف و شفاف آئینہ تھی جو کہ اُس دور کا اخبار اور آج کے اُس دور کی تواریخ ہے۔ حافظ ابراہیم کی شاعری اپنے دور کی ترجمانی کے علاوہ قدیم و جدید اسلوب بیان، زمانے کی روح اور ثقافت و تہذیب کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کا سبب بھی بنی۔

حافظ ابراہیم کی شاعری کے علاق و قدور کا تجزیہ کرنے پر یہ عیاں ہوتا ہے کہ اُن کی شاعری خالص مصریت کے مادہ سے پیدا ہو کر، غربت، بے روزگاری، غلامی اور رنج والم سے

بھرے سماجی ماحول میں نشوونما پا کر، عربیت کے حسن و رعنائی سے آراستہ و پیرا استہ ہو کر، قوم پرستی اور وطنیت کے رنگوں میں اس قدر رنگ گئی کہ مصری قوم کے جذبوں، آرزوؤں اور امنگوں کی زبان بن گئی۔

حافظ ابراہیم نے اپنی نا اُمیدیوں اور مایوسیوں کا شکوہ کرنے کے بجائے اپنی انفرادیت کو قوم کی اجتماعیت میں یوں گم کر دیا کہ اُس کا اپنا درد قوم کا درد بن گیا اور اُس کے نالے قوم کے ترانوں میں گم ہو گئے۔ اُس نے اپنی شاعری کو غموں کی تپش سے اس قدر پر درد و پر سوز بنایا کہ ہر سامع وقاری کو اس میں اپنا درد جھلکتا دکھائی دیا۔

حافظ ابراہیم نے لوگوں کے درمیان رہ کر ان کی ہر بخش کو پہچانا اور یوں وہ قوم کا نباض بن گیا۔ ان کی شاعری طبیانہ فہم کی شاعری تھی، جو کہ معاشرے میں چھپے ناسوروں کو پہلے تو عیاں کرتی تھی، پھر ان پر نشتر زنی کرتی تھی اور بعد میں ان کا علاج بھی ڈھونڈتی تھی۔ ان کی شاعری ہمیشہ وقت کے حکام کی ٹوہ میں لگی رہتی تھی، ان کی غماری کرتی رہتی تھی، ان کے کروٹوں پر ان کا تمسخر اڑاتی تھی، ان کے عیوب کا پردہ فاش کرتی تھی اور ساتھ ہی ساتھ معاشرے کی اصلاح و تبدیلی میں بھی اپنا کردار ادا کرتی تھی۔

حافظ ابراہیم یونہی بے مقصد شاعرِ الشعب، قومی شاعر، سماج کا شاعر اور شاعرِ انقلاب نہیں کہلایا بلکہ اُس کی شاعری صحیح معنوں میں نہ صرف قوم کے دکھر دکی ترجمان تھی بلکہ ان کے فلاج و بہبود کی نقیب بھی تھی۔ وہ ہر موڑ پر اپنے ہم وطنوں کو نہ صرف حوصلہ بخشنے بلکہ راہ میں پیش آنے والے خطرات سے بھی آگاہ کرتے اور ساتھ ہی انہیں روشن مستقبل کی جھلک بھی دکھلاتے تھے۔

حافظ ابراہیم ایسے شاعر تھے جنہوں نے حدیث ذات کو حدیث روزگار یا غم ذات کو

غمِ روزگار میں ڈھال دیا تھا۔ اُن کے کلام میں مقصدیت، اصلاح احوال، متواتر عمل اور مستقل جدوجہد کے پیغامات غالب تھے۔ اس کے علاوہ اُن کی شاعری لوگوں کے لئے بلندیٰ خیالات، مضبوطی ہمت اور وسیع النظری کا باعث بھی بنی۔

انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے نہ صرف اپنی قوم کے دلوں میں بھڑکنے والے انقلاب کی ترجمانی کی بلکہ انہوں نے شاعری کو اپنی قوم کی اصلاح کے لئے ایک معلم کے طور پر استعمال کیا ہے۔

اقبال دُنیا کے ادب کا وہ منفرد شاعر ہے جس کا کوئی اسکول نہیں اور نہ وہ شاعری کے کسی ”درس“ سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ ایسا شاعر ہے جس کافن اپنی دُنیا آپ تراشتا ہے۔ انہوں نے کم و بیش اپنی شاعری کی زبان خود ہی وضع کی ہے۔ اس تحقیقی مقالے میں اقبال کو اُن کے کلام کی روشنی میں بحیثیت ایک شاعر کے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ اُن کے نظریات، خیالات اور پیام کو سمجھا جاسکے۔ اُن کی شخصیت کے تین پہلو ہیں یعنی شاعر، فلسفی اور مُفکر اور یہ دوے سے نہیں کہا جا سکتا کہ کب اُن کے کلام میں اُن کا کونسا پہلو حاوی ہو جائے اس لئے اُن کے کلام کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے اُن کی شخصیت کے سچی پہلوؤں کو کامل طور سے جان لینا ضروری ہے۔

جہاں اُن کا شاعر کا پہلو حاوی ہے تو وہاں اُن کی شاعری باغ صور اسرائیل ہے جو کہ مختلف مراحل یا ادوار سے گزر کر ایک ایسے مقام پر پہنچ گئی تھی جہاں سے اُس نے آوازِ رحیل کاروان، نغمہ جرنیل آشوب یا جزو پیغامبری کے لئے جست لینی تھی۔ جہاں وہ مُفکر ہیں تو اُن کی فکر میں ابتداء اور انہتا کے اسرار ہیں۔ خودشناسی سے لے کر خداشناسی تک کا سفر ہے اور

اگر وہ بحیثیتِ فلسفی ہیں تو اُنکا فلسفہ تصوف کے کیف یعنی عبودیت و معبدیت اور عشق و محبت میں ڈوبا ہوا ہے۔

اقبال نے اپنی شاعری میں فکر و اجتہاد سے کام لیا ہے۔ اُنہوں نے شعر میں غور و فکر کے عناصر کی آمیزش کی۔ اُن کے اشعار میں رجائیت کا ایک طوفان ہے۔ بے چارگی اور اداسی اُن کے کلام کو چھو کر نہیں گزرتی۔ اُن کے نزدیک انسان رازگُن فکاں ہے جسے صرف اپنی آنکھوں پر عیاں ہونے کی ضرورت ہے۔ اُن کی ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ انسان کے اندر قوتِ یقین پیدا ہو۔ یہ اپنے طرز کی شاعری میں پہلی کوشش ہے۔ نظم کے علاوہ اُنہوں نے غزل کو بھی ایک نئے رجحان سے آشنا کیا۔ اُنہوں نے غزل کو تعفن آمیز ماحول سے نکال کر زندگی کے رنگین مسائل سے آشنا کر دیا اور یوں اسے کھلی فضائیں سانس لینا سکھایا۔

ابتداء سے ہی غیر تقلیدی ذہن کے مالک اور نگاہ میں ایک وسیع افق رکھنے والے اقبال کا فکر و فلسفہ غزل کے مخصوص عالمتی نظام میں نہ سما سکا، اس لئے اُنہوں نے غزل کو ایک نئے اندازِ تفکر سے سفر فراز کیا۔ پھر اُنہوں نے دوسری اصناف کا رُخ کیا لیکن اُن کا علوٰ تَخیل ان میں بھی نہ سما سکا، یہاں تک کہ اردو زبان ہی کم مایہ ثابت ہوئی تو اُنہوں نے فارسی کا رُخ کیا جو ان کے لئے موزون ترین زبان تھی۔

اقبال شعر کے نام نہاد حُسن سے زیادہ موضوع و معانی پر زور دیتا ہے۔ اُنہوں نے حرف و معنی کے ارتباط کو جان و تن کے اختلاط سے تشییہ دی ہے۔ اُنہوں نے معنوی پہنائیوں کا جو چلن شروع کیا وہ اُن پر ہی ختم ہوا۔ اس ضمن میں اُنہوں نے اصطلاح سازی کے لئے پُرانے لفظوں کو ایسے استعمال کیا کہ اُنہیں نئے معنی بخش دیئے۔ اُن کے نزدیک شعر و نغمہ

کا یہ معیار ہے کہ نغمہ سیل کی مانند تُندر و ہوتا کہ وہ دل سے غم و اندوہ کو دُور کر سکے۔

۔

دلبری بے قاہری جا دو گری است
دلبری با قاہری پیغمبری است

گر ہُنر میں نہیں تعمیر خودی کا جو ہر
وائے صورت گری و شاعری وفاۓ سرور

یہی وجہ ہے کہ کلامِ اقبال تصور سے زیادہ وجد ان پر چھا جاتا ہے۔

اقبال کی شاعری مشرق کے لئے سیاسی، معاشی، تہذیبی اور فکری استحصال سے چھکارا حاصل کرنے کے لئے ایک حرکتِ عمل اور انقلاب کا پیغام تھی۔ اُن کی شاعری کا پیغام بغاوت، تبدیلی اور تغیر ہے۔ اسے نئی بیداری کی آواز کہنا مناسب ہوگا۔ اُنہوں نے شاعری کا مزاج ایسے بدلا کہ اُسے حجرہ والیوں سے نکال کر میدان و کوہ سار میں لاکھڑا کر دیا، دریاؤں اور سمندروں میں ڈبکی لگانے کے بجائے اسے آسمان و افق میں پرواز کرنا سکھلا یا اور انفرادی وارداتوں کا امین بننے کے بجائے اسے اجتماعی مسائل و حوادث کا آئینہ بنایا۔

اقبال ایک عہد آفریں شاعر ہے۔ وہ ہر دور کے شاعر ہیں۔ اُن کی شاعری زماں و مکاں کی قید و حد سے پرے پوری انسانیت کا احاطہ کرتی ہے۔ وہ عظمتِ آدم کے قائل ہیں اور اُن کا کلام عظمتِ صحیفہ آدم ہے۔ وہ ایک ایسے ادبی مصور تھے جنہوں نے عالمِ انسانیت تک نہ صرف احترامِ آدمیت کا پیغام پہنچایا بلکہ اسے اُن کے دل و دماغ پر نقش کر دیا۔

بقول سردار جعفری:

”ابھی تک اردو زبان نے اقبال سے بڑا شاعر پیدا نہیں کیا ہے۔ وہ ہمہ گیری اور وسعت ابھی کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوئی جو اقبال کی شاعری میں پائی جاتی ہے۔“^۱
 حافظہ اور اقبال کے کلام میں شعریت واثر کی وجہ ان کے احساس کا قوی اور لطیف ہونا ہے۔ انہوں نے زندگی کے کئی موضوعات جیسے کہ قوموں کا عروج و زوال، زمانے کے فلسفہ، تحول و انقلاب، نفسیاتِ اجتماع کے رموز و اسرار، مردہ دلوں کے قومی و مذہبی جذبات کو اپنے خوشنما الفاظ و انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ شاعری میں جذبات اور دلی احساسات کو اس طرح سے ادا کرتے تھے کہ ان کے اندر کی ترڈ پٹا ہوتی تھی۔ جو کہ پڑھنے اور سننے والے کی روح کو بھی ترڈ پادینے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

عربی اور اردو و فارسی کے ان دو سرکردہ انقلابی شاعروں کے درمیان مطابقوں اور مماثلوں کا تحقیقی جائزہ پیش کرنے کے بعد میں یہ باتیں وثوق سے کہتی ہوں کہ ہر بڑا شاعر جہاں اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے وہیں وہ ماحول کو بھی متاثر کرتا ہے۔ اقبال اور حافظہ ابراہیم اُس عہد میں پیدا ہوئے جسے انسیوسیں صدی کے وسط کی فلکری اور سیاسی بغاوت نے جنم دیا۔ جہاں سامراج چاروں طرف آسیب کی طرح اپنا مکروہ و مہیب سایہ پھیلائے ہوئے تھا۔ اس لئے دونوں شعراء کی شاعری پر اس فلکری اور سیاسی بغاوت کی چھاپ موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں شعراء کا کلام بیک وقت روایت پرست اور روایت سے باغی طرز کا کلام ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ کے مطابق:

۱۔ سردار جعفری، ترقی پسند ادب، ص۔ ۱۰۲۔

”بڑا شاعر یا تو کسی روایت کا خاتم ہوتا ہے یا کسی طرزِ نو کا موجودہ بہر حال
باغی ہوتا ہے۔ وہ فرسودہ روایات پر کاری ضرب لگاتا ہے۔ اظہار کے لئے نئے پیانے
تراشتا ہے اور نئی شعری گرامر خلق کرتا ہے۔ وہ یا تو اپنے زمانے سے آگے ہوتا ہے یا
اپنے عہد کے درد و داغ و سوز و ساز و جستجو و آرزو کی ایسی ترجمانی کرتا ہے کہ اپنے وقت
کی آواز بن جاتا ہے،“ ۔

ٹھیک اسی طرح اقبال اور حافظ ابراہیم نے اپنے زمانے میں تعلیم، سیاست، مذہب، قومیت،
زبان اور معاشرت کو زندگی کے اہم مسائل کے طور پر لیا تھا اور ان کی تجدید و اصلاح کر کے وہ قوم
میں زندگی کی روح بیدار کرنا چاہتے تھے۔ چونکہ ان کی قوی میں خواب غفلت میں بنتا تھا، اس لئے
ان کے لئے شاعری کی زبان میں ایک ایسی اذانِ سحر کی ضرورت تھی جو کہ پُر جوش، ولوہ انگیز اور
ہنگامہ خیز ہو۔ جو ان کو غفلت کی نیند سے بیدار کر دے۔ ان کے احساس پر کچو کے لگائے، ضمیر کو
جھنجھوڑے اور دلوں میں وہ حرارت بھردے کہ وہ ایک انقلاب کا باعث بن جائیں۔ اس بات میں
بالکل بھی شبہ نہیں کہ دونوں شعراء نے اس کی حق ادا نئیگی کا فرض مکمل اور احسن طور نبھایا ہے اور اس ضمن میں
میں دونوں شعراء کے خیالات کا تدریجی انقلاب زندہ قوموں کے لئے ہر دور میں سبق آموز ہے۔
اقبال اور حافظ ابراہیم کی شاعری کے جن پہلوؤں کی طرف تحقیق کے طالب علموں کی
توجه مبذول کرنے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ شاعری کو رنگ و آہنگ میں ڈھال کر کس
طرح عالمی بصیرت پیش کی جاسکتی ہے۔



کتابیات

(اُردو)

آثارِ اقبال	غلام دنگیر شید	ادارہ اشاعت حیدر آباد کن، ۱۹۳۲ء
آئینہ اقبال	محمد عبداللہ قریشی	آئینہ ادب لاہور، ۱۹۶۲ء
آمگری اقبال	پروفیسر مرغوب بانہائی	وجہت پبلیکیشنز، حضرت بل، ۱۹۵۰ء
اقبال، ایک تجربیہ	پروفیسر بشیر احمد نجوی	شالیمار آرت پر لیں، سرینگر ۲۰۵۴ء، جنوری
اقبال، سب کے لئے	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	ایجو کیشنل پبلیشنگ ہاؤس، ڈہلی ۲۰۰۰ء
اقبال اور غزل	محمد امین اندرابی (مرتب)	اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی ۱۹۸۸ء
اقبالیات کا تنقیدی جائزہ	مرتب محمد امین اندرابی	شالیمار آرت پر لیں، سرینگر، فروری ۱۹۹۷ء
اقبال، اس کی شاعری اور پیغام	شیخ اکبر علی	کمال پبلیکیشنز، لاہور طبع اول، ۱۹۷۲ء
اقبال، پیامبر انقلاب	شورش کاشمیری	فیروز سترز، لاہور، ۱۹۶۸ء
اقبال، شاعر اور فلسفی	سید وقار عظیم	تصنیفات لاہور، ۱۹۶۸ء
اقبال، تصویر عشق	غلام عمر خان	ادارہ ادبیات، حیدر آباد کن، ۱۹۶۳ء
اقبال کا فلسفہ خودی	محمد عثمان	مکتبہ جدید لاہور، ۱۹۶۱ء
اقبال کی شاعری	عبدالمالک آروی	ادارہ طاق بستان، آرہ، ۱۹۴۰ء
اقبال کی شخصیت اور شاعری	رشید احمد صدیقی	اقبال اکیڈمی، لاہور، ۱۹۷۱ء
اقبال، مدد عصر	سمیل احمد بخاری	الضاد، ۱۹۹۱ء

اقبال پر ۱۵۰ مقالات	پروفیسر احسان الحق سالک	عزیر پبلیکیشنز لاہور کے ۱۹۷۸ء
اقبال، دنائے راز	عبداللطیف عظیمی	مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۱۹۸۷ء
اقبال منفرد	مرتب سید معراج جنبر	مکتبہ عالیہ اناکٹی لاہور کے ۱۹۷۶ء
اقبال، نئی تشکیل	عزیز احمد	اعتقاد پبلیشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۴ء جنوری
اقبال، معاصرین کی نظر میں	مرتبہ پروفیسر سید وقار عظیم	مجلس ترقی ادب، کلب روڈ لاہور ۳۲۷۶ء
اقبال کامل	مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم	مطبع معارف اعظم گدھ ۱۹۸۵ء
اقبال، شعائے صدر نگ	ڈاکٹر سلیمان اختر	سنگ میل پبلیکیشنز چوک لاہور ۸۷۶۷ء
اقبال نامہ حصہ اول و دوم	شیخ عطاء اللہ	شیخ محمد اشرف تاجر کتب، کشمیری بازار
اقبالیات کے نقوش	ڈاکٹر سلیمان اختر	اقبال اکیڈمی پاکستان کے ۱۹۷۶ء
انوارِ اقبال	بیشرا حمدلہ	ایضاً سنندارد
اقبال اور عالم عربی و دیگر مقالات	ڈاکٹر بدال الدین بڑت	اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی
اقبال، نقش ہائے رنگ رنگ	ڈاکٹر تکلیفہ فاضل	فضل پبلیکیشنز سرینگر ۲۰۰۳ء
اقبال اور ان کے معاصر شعراء اور ادباء	ایضاً	ایضاً ۲۰۰۳ء
اقبال اور دوہزار سوالات	محمد کلیم	مکتبہ تعمیر انسانیت بازار لاہور
اقبال اور جدید شاعری	ڈاکٹر پریمی رومانی	کریست ہاؤس پلی کیشنز جمیون ۲۰۰۲ء
اقبال اور عالمی ادب	پروفیسر عبد الغنی	ادارۃ ترقی اردو درجمنگ پٹشن
اقبال کا تخلیقی شعور	پروفیسر حامدی کاشمیری	اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی ۲۰۰۳ء
اقبال کا کافن	گوپی چند نارنگ	انجوبیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی
اقبال کی جمالیات	پروفیسر قدوس جاوید	شالیما رارٹ پر لیں سرینگر ۱۹۹۸ء
اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر عبدالشکور	اقبال اکیڈمی پاکستان ۲۰۰۳ء
اقبال، العالم العربي	ڈاکٹر مجیب حسین مصری	قاهرہ ۱۹۷۶ء

اعتقاد پیشگنگ ہاؤس، دہلی	شرح یوسف سلیم چشتی	ارمنگان حجاز
ایمکیشن پیشگنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۲ء	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	اردو شاعری کافی ارتقا
الیضا، ۱۹۹۸ء	الیضا	اسرار خوری
اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۳ء	ڈاکٹر وحید قریشی	اساسیاتِ اقبال
دہلی، چھاتر مارک، ۲۰۰۲ء	عبد الحق	اقبال اور اقبالیات
الیضا، ۱۹۹۱ء	الیضا	بانگ درا (مع شرح)
الیضا، ۱۹۸۰ء	الیضا	بال جبریل (مع شرح)
المقبول پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۶۹ء	صلاح الدین احمد	تصوراتِ اقبال (جلد اول)
اعتقاد پیشگنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۹۳ء	پروفیسر یوسف سلیم چشتی	جاوید نامہ (مع شرح)
اقبال آکیڈمی سرینگر، جنوری ۱۹۸۹ء	مرتب پروفیسر بشیر احمد نجومی	حکیم مشرق
فرید بک ڈپورڈریائی گنج، نئی دہلی، سال اشاعت ۲۰۰۳ء	عزیز برلنی	داستان ہند
جمال پریس، چنی بک ڈپورڈلی	عبد الجید سالک	ذکرِ اقبال
مکتبہ جامعہ لمبیڈ، دہلی، ۱۹۶۲ء جولائی	ڈاکٹر یوسف حسین خان	روحِ اقبال
اعتقاد پبلیکیشنز، نئی دہلی، ۱۹۸۲ء	پروفیسر یوسف سلیم چشتی	زبورِ حجم مع شرح
غلام علی پبلیشرز، لاہور، ۱۹۷۵ء	جاوید اقبال	زندہ رو د۔ حیاتِ اقبال کا تکمیل دور
غلام علی پبلیشرز، لاہور، ۱۹۸۴ء	جاوید اقبال	زندہ رو د۔ حیاتِ اقبال کا وسطی دور
غلام علی پبلیشرز، لاہور، ۱۹۸۳ء	جاوید اقبال	زندہ رو د۔ حیاتِ اقبال کا اختتامی دور
معارف پریس، عظم گلڈھ، ۱۹۸۰ء	ڈاکٹر محمد عزیز	سلسلہ تاریخ اسلام دولت غثانیہ
قومی کتب خانہ، لاہور، ۱۹۳۳ء	محمد طاہر فاروقی	سیرتِ اقبال
قاری پبلیکیشنز، سنندھ	فارسی شرح - ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی	شرح ارمغان حجاز (فارسی اردو)
بزمِ اقبال، لاہور، ۱۹۵۹ء	سید عبدالعلی عابد	شعرِ اقبال

اعقاد پبلیکیشنز، نی دہلی، ۱۹۹۱ء	پروفیسر یوسف سلیم چشتی	ضرب کلیم مع شرح
ایجوشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ایڈیشن - ۲۰۰۲ء	ڈاکٹر غلیفہ عبدالحکیم	فکرِ اقبال
ادارہ تحقیقات و نشریات، یوپی ۲۰۰۳ء نومبر	ابن احمد نقتوی	فکرِ اقبال
الینڈ ۱۹۹۷ء	مرتبہ بزم اقبال	فلسفہ اقبال
حیدر آباد کن، ۱۹۳۶ء	علامہ اقبال ترجمہ میر حسن الدین	فلسفہ عجم
عماد پریس، حیدر آباد کن، ۱۹۲۳ء	مرتبہ عبد الرزاق	کلیاتِ اقبال
جموں و نیما کیڈیجی آف آرٹ، کلپر اینڈ لینگو ججز سری ۱۹۰۰ء	ڈاکٹر آبر حیدری	کلامِ اقبال (نادرو نیا برسالوں کے آئینے میں)
دانشگاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۲۹ء	مرتبہ محمد فیض افضل	گفتارِ اقبال
امرت ایکٹر ک پریس لاہور، طبع اول	مرتبہ محمود نظامی	ملفوظاتِ اقبال
بزم اقبال، لاہور سن ندارد	مرتبہ بزم اقبال	منشوراتِ اقبال
طبع علمی پرنٹنگ پریس، بارس - ۲، ۱۹۷۳ء	جاودیہ اقبال	مئے لالہ فام
آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۶۹ء	سید عبدالواحد	نقشِ اقبال
محل نشریاتِ اسلام، کراچی، ۱۹۷۷ء	سید ابو الحسن ندوی	نقوشِ اقبال
بک کار پریشان دلی - ۲۰۰۴ء	ڈاکٹر سید عبداللہ	ولی سے اقبال تک



كتابيات

(عربي)

الاتزام في الشعر العربي	د.أكـرـاحـمـاـبـحـاقـه	دار العلوم للمسـلمـيـنـ، ١٩٧٩ـعـ
الشعر العربي الحديث	سـ، مـوـرـيـهـ	نـاـعـلـومـ
الشعر العربي المعاصر	دـ، أـكـرـطـ الـطـاهـرـ اـحـمـيـكـ	دار المـعـارـفـ، ١٩٨١ـعـ
اعلام التـشـرـ وـاـشـعـرـ فـيـ اـعـصـرـ اـعـرـبـيـ اـحـدـيـثـ	مـحـمـدـ يـوسـفـ كـوـنـ	دار الـخـافـقـ لـلـطـبـ بـعـتـةـ مـدـرـاسـ، ١٩٨٠ـعـ
الشعر العربي الحديث المعاصر	دـ، أـكـرـطـ مـحـمـودـ شـوـكـتـ	دار الـقـرـاءـ عـرـبـيـ القـاهـرـهـ
الاتجـاهـاتـ الـقـومـيـةـ فـيـ اـشـعـرـ عـرـبـيـ اـحـدـيـثـ	عـمـرـ رـاقـقـ	مـكـتبـهـ دـارـ الشـرقـ، حـلـبـ، ١٩٢٣ـعـ
الاتجـاهـاتـ الـوطـنـيـةـ فـيـ الـادـبـ الـمـعاـصـرـ	دـ، أـكـرـطـ مـحـمـدـ حـسـينـ	داـرـ وـالـرـشـادـ يـادـرـوتـ، ١٩٧٤ـعـ
الادـبـ عـرـبـيـ الـمـعاـصـرـ	دـ، أـكـرـطـ شـوـقـ ضـيـفـ	دارـ الـعـارـفـ بـعـصـرـ، ١٩٦١ـعـ
تطور الـادـبـ الـحـدـيـثـ فـيـ مـصـرـ	دـ، أـكـرـطـ اـحـمـيـدـ يـكـلـ	دارـ الـعـارـفـ بـمـصـرـ، ١٩٨٣ـعـ
تـارـيـخـ الـادـبـ عـرـبـيـ	احـمـدـ اـزـيـاتـ	شـيخـ عـلـىـ اـيـنـدـ سـنـزـ، بـلـاشـرـزـ، لـاـهـورـ
تطور اـشـعـرـ عـرـبـيـ الـحـدـيـثـ فـيـ مـصـرـ	دـ، أـكـرـطـ مـاهـرـ حـسـنـ فـيـ	مـكـتبـهـ نـهـضـةـ اـمـرـقـاـ، ١٩٥٨ـعـ
تـارـيـخـ الـادـبـ عـرـبـيـ	حـنـاـ الفـاحـورـيـ	مـطـبـعـ الـبـولـيـيـ
تـارـيـخـ اـشـعـرـ عـرـبـيـ الـحـدـيـثـ	احـمـقـيشـ	دارـ جـيلـ، بـيـرـوتـ، بـلـانـانـ

وزارة المعارف، مطبع بغداد، ١٩٢٩	ڈاکٹر جبیل سید، عبدالرازق و احمد حامد الشرقاوی	تاریخ الادب العربي الحديث
دارالبيروت، ١٩٢٥	عبدالطیف شیرازہ	حافظ دراسة تخلیلیہ
مطبع الاعتماد بمصر، ١٩٣٧	روفائل مسیح	حافظ ابراهیم الشاعر الیاسی
دار المعارف بمصر، ١٩٥٩	عبدالحمید سند الجندی	حافظ ابراهیم شاعر العلیل
دار الفکر العربي، قاهره	ڈاکٹر نعمات احمد فواد	خاصّیّات الشعر الحديث
المطبع الاميري، طبع ١٩٣٨	حافظ ابراهیم	دیوان حافظ ابراهیم
بیروت، ١٩٢٩	حافظ ابراهیم	دیوان حافظ ابراهیم
دار المعارف بمصر، ١٩٥٥	ڈاکٹر سامي الدھان	شاعر الشعب
دار الهلال	طاہر الطباجی	شوقی وحافظ
الدار القومية القاهرية، ١٩٢٥	عبد الرحمن الرافعی	شعر الوطنية في مصر
دار المعارف بمصر	ڈاکٹر شوقی ضيف	قصول في الشعر ولقد
دار الكتاب، بیروت، ١٩٣٧	ڈاکٹر طھیں	مجموعۃ تایفات طھیں
المطبع الاميري، مصر، ١٩٣٨	احمد امین	مقدمہ دیوان حافظ ابراهیم
مطبع جامعہ آکسفورڈ	مصطفی بدوى	محترمات من الشعر العربي الحديث
طبعۃ جنوری ١٩٥٦	احمد الطاہر	محاضرات عن حافظ ابراهیم
دار المعارف بمصر، ١٩٥٣	عمر الدسوی	محمود سامي البارودي



BOOKS IN ENGLISH

1.	A Bibliography of Iqbal	By K. A. Waheed	Iqbal Academy, Karachi-1965
2.	A study of Iqbal's Philosophy	By B. A. Dar	Sh. Gh. Ali & Sons, Lahore-1971
3.	A voice from the East	By Sir Zulfiqar Ali	Iqbal Academy, Karachi-1954
4.	History of the Islamic world	By M. Ahsanullah	Deep & Deep Publications New Delhi.
5.	Iqbal: his art and thought	By S. A. Waheed	Oxford University Press London-1959.
6.	Liberal Nationalism in Egypt	By Zaheer Qurashi	Kitab Ghar Pvt Ltd, Zero Road, Allahabad.
7.	Modern Egypt	By Tom Little	London 1968, Edition 2nd
8.	Modern Arabic Literature	By Jon A. Heywood	London 1971
9.	Modern Arabic Literature	By Dr. Ismat Mehdi	
10.	Modern Egypt Vol. II	By Earl Cromer	Oxford University Press London.
11.	Political and Social changes in Egypt	Edited By: P. M. Holt	Oxford University Press Great Britain- 1968.
12.	Poetry and the making of the modern Egypt	By Mounah A. Khouri	Loiden E.J. Brill - 1971
13.	The Founder of Modern Egypt	By Henry Dodwell	Cambridge University Press London- 1931
14.	The Poet of the East	By A. Anwar Beg	Lahore - 1940.





- (۱) برہان، جولائی ۱۹۵۸ء۔
- (۲) الہلال، اکتوبر ۱۹۸۳ء۔
- (۳) نیرنگِ خیال، (اقبال نمبر)۔
- (۴) علی گڑھ میگرین (اقبال نمبر)۔
- (۵) صحیفہ (اقبال نمبر) مجلس ترقی ادب لاہور، شمارہ ۲۵، ۷۹۷۶ء۔
- (۶) اقبال، بزم اقبال لاہور، جلد ۱۳، شمارہ ۲۵، اکتوبر ۱۹۶۳ء۔
- (۷) نقوش (اقبال نمبر ۲)، ادارہ فروغ اردو لاہور، دسمبر ۷۹۷۶ء۔



